آغا گل کے فکشن میں بلوچستان کی تہذیب وثقافت کی عکاسی

(ایک تنقیدی جائزہ)

مقالہ برائے ایم فل

نگران	مقالہ نگار
ڈاکٹر طیب منیر	منزہ مبین

رول نمبر۔ FLL-۷۷

رجسٹریشن نمبر۔ FLL/MSURDU/F۱۰-۷۷

شعبہ اردو

کلئیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

International Islamic University Islamabad

Accession No. TH/1318

MS
891.4393
م ن ز
اردو ادب - افسانہ -

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student:

Title of the Thesis:

Registration No:

Accepted by the Department of Urdu,Faculty of language & Literature,International Islamic University,Islamabad ,in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

External Examiner	Dr. Touseef Tabassum
Internal Examiner	Dr. Aziz Ibnul Hassan
Supervisor	Dr. Tayyab Munir

Chairpersor

Deptt of Urdu Female Campu:

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ مسمّاۃ جبین جسٹریشن نمبر 22-FLL/MS URDU/F-10 نے مقالہ بعنوان "آغا گل کے فکشن میں بلوچستان کی تہذیب و ثقافت کی عکاسی: ایک تنقیدی جائزہ" برائے حصول سند ایم ایس/ایم فل اردو میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ زبان و بیان، تحقیق و تنقید کے حوالے سے پیش نظر مقالہ اس لائق ہے کہ ایم فل کی ڈگری کے لیے پیش کیا جا سکے۔

ناظم امتحانات بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے گزارش ہے کہ مقالہ ممتحنین کو برائے جانچ ارسال کر دیا جائے۔

(دستخط)

(ڈاکٹر طیبہ منیر)
ایسوسی ایٹ پروفیسر (شعبہ اردو)
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

بتاریخ
۱۸ جنوری ۲۰۱۳ء

Chairperson, Department
International Islamic University,
Islamabad.

3

DEPARTMENT OF URDU
Women Campus, IIU, Islamabad
Dy. No.........................
Dated:.........................

حرفِ آغاز

گھر میں تعلیم حاصل کرنے کا رواج شروع ہی سے تھا۔ میں نے ایم فل کرنے کی خواہش ظاہر کی تو گھر والوں نے سراہا۔ مجھے ابتداء ہی سے افسانوی ادب سے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ میں فارغ اوقات میں ہمیشہ افسانے اور ناول پڑھنے کو ترجیح دیتی ہوں۔ جب ایم فل کے آخری سمسٹر میں مقالے کے موضوع کے انتخاب کے لیے کہا گیا تو ہمارے شعبہ اردو کے چیرمین ڈاکٹر رشید امجد نے مجھے آغا گل کے فکشن پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ اگرچہ اس سے قبل آغا گل کی فکشن نگاری پر ایم اے کی سطح کا کام ہو چکا ہے۔ لیکن ان کے فکشن میں بلوچستان کے تہذیبی عناصر کے حوالے سے کام نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے اپنے اساتذہ کی رہنمائی اور مشاورت سے ''آغا گل کے فکشن میں بلوچستان کی تہذیب وثقافت کی عکاسی'' پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا عزم کیا۔ بلوچستان ہمیشہ میرے لیے ایک پراسرار خطہ رہا ہے میری بدقسمتی کہ میں کبھی بلوچستان نہ جا سکی۔ لیکن بلوچستان کے تاریخ پسِ منظر، قبائلی نظام اور جغرافیائی حالات کی سوجھ بوجھ حاصل نہ کر سکی۔ جب آغا گل کے افسانے زیر مطالعہ آئے تو مجھے ان بہت سے سوالات کے جوابات مل گئے جن کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی خواہش ایک عرصے سے میرے دل میں تھی۔ ان کے فکشن نے مجھے بلوچستان کے بڑے بڑے قبائل کی معاشرت سے متعلق روشناس کروایا۔ جس میں مری، بگٹی، مینگل، اچکزئی، رئیسانی شامل ہیں۔

جب کام کا آغاز کیا تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ کیا کرنا ہے۔ یقیناً پڑھنا آسان ہے مگر پڑھے ہوئے کے بارے میں تحقیقی مقالہ لکھنا زیادہ مشکل ہے۔ میں نے نگران کی رہنمائی میں کام کرنے کا آغاز کر دیا۔ اس مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا۔ پہلا باب ''آغا گل، احوال آثار''، دوسرا باب ''اردو ناول نگاری کی روایت'' ہے۔ اس باب میں قیامِ پاکستان سے قبل اور پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد کے ناول کی مختصر تاریخ اور رجحانات کو بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی بلوچستان ایک تعارف، تہذیب وثقافت کی تعریف، بلوچ ثقافت کی خصوصیات، بلوچستان میں اردو ادب کی روایت کے حوالے سے لکھا گیا۔ اس کے بعد آغا گل کی ناول نگاری میں بلوچستان کی تہذیب وثقافت کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرا باب ''اردو افسانہ نگاری کی روایت'' ہے۔ جس میں افسانے کی تعریف اور اردو افسانے کی تاریخ

قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں مختصراً بیان کیا گیا ہے۔اور اس کے بعد آغا گل کی افسانہ نگاری میں بلوچستان کی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔چوتھا باب ''مجموعی جائزہ'' ہے۔

زیرِ نظر مقالے کو مکمل کرنے میں جن کتب و رسائل ،اخبارات اور دیگر ماخذات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ان کی فہرست مقالے کے آخر میں کتابیات میں موجود ہے۔اگر چہ یہ کام بہت مشکل تھا۔امید ہے اہل علم میری لغزشوں کو طالب علمانہ کوتاہیاں سمجھ کر ان سے صرف نظر کریں گے۔

میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں جس کی مدد ہر موڑ پر میری شامل حال رہی۔یہاں یہ اعتراف کرنا لازم ہے کہ اس مقالے کے نگران ڈاکٹر طیب منیر نے مجھے اس مقالے کی تکمیل کے ہر مرحلے پر مدد فراہم کی۔میں ان کی نہایت ممنون ہوں کہ انہوں نے میری راہنمائی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ان کی پر خلوص مدد کے بغیر شاید میں مقالہ مکمل نہ کر سکتی۔یہاں میں آغا گل کا بھی شکریہ بھی ادا کروں گی جنھوں نے اپنی ذاتی ،دفتری اور دیگر مصروفیات کے باوجود مجھے وقت دیا۔اور جو کچھ میں نے ان سے دریافت کیا انہوں نے خوش دلی سے بلا تاخیر فراہم کیا۔اس کے علاوہ شعیب بلوچ کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مواد تک رسائی کے حوالے سے میری مدد کی۔

آخر میں اپنے اہل خانہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے مجھے اس مقالے کی تکمیل کے لیے ہر ممکن مدد فراہم کی جس کے باعث آج میں یہ مقالہ مکمل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

منزہ مبین

دسمبر ۲۰۱۲ء

فہرستِ ابواب

حرفِ آغاز ☆

باب اول:

آغا گل، مختصر احوال: ولادت۔۔۔۔بچپن۔۔۔۔تعلیم۔۔۔۔۔ملازمت۔۔۔۔شادی۔۔۔۔۔
مشاغل۔۔۔۔۔تحسین۔۔۔۔

آثار: گورپیچ۔۔۔۔۔آکاش ساگر۔۔۔۔۔راسکوہ۔۔۔۔۔مہرگڑھ۔۔۔۔۔گوانگو۔۔۔۔۔
پرتھوی غوری۔۔۔۔۔پرندہ۔۔۔۔۔ڈاک پہ ڈاکہ۔۔۔۔۔دشتِ وفا۔۔۔۔۔بیلہ۔۔۔۔۔بابو۔۔۔۔
بلوچی بائبل۔۔

باب دوم:

اردو میں ناول نگاری کی روایت: ناول کا فن۔۔۔۔۔اردو ناول کا قیام پاکستان سے قبل۔۔۔۔اردو
ناول قیامِ پاکستان کے بعد۔۔۔۔۔بلوچستان ایک تعارف۔۔۔۔۔تہذیب وثقافت۔۔۔۔۔بلوچ
ثقافت کی خصوصیات۔۔۔۔۔بلوچستان میں اردو ادب کی روایت۔۔۔۔۔آغا گل کی ناول نگاری۔۔۔
۔۔دشتِ وفا۔۔۔۔۔بابو۔۔۔۔۔بیلہ۔۔۔۔

باب سوم:

اردو افسانے کی روایت۔۔۔۔۔اردو افسانے پر ایک اچٹتی نظر۔۔۔۔۔قیام پاکستان کے بعد اردو افسانہ
۔۔۔۔۔آغا گل، افسانوی مجموعہ ایک جائزہ۔۔۔۔۔بحوالہ تہذیب وثقافت کی عکاسی۔۔۔۔

چوتھا باب:

مجموعی جائزہ

☆ کتابیات

☆ ضمیمہ جات

باب اول:

آغا گل، احوال و آثار

آغا گل کا اصل نام آغا انور گل ہے۔ادبی زندگی کا آغاز ہوا تو ''آغا گل'' کے قلمی نام سے لکھنے لگے۔علم الاعداد اور علم نجوم پر یقین کے باعث نام کے عدد آٹھ کر دیئے۔تا کہ ستارہ زحل زیادہ پر اثر ہو۔آغا گل بلوچستان کے قصبہ ہرنائی میں ۱۹ نومبر ۱۹۵۱ء کو محمد اکبر خان کے ہاں پیدا ہوئے۔

آغا گل کا تعلق لودھی پٹھانوں سے اور ان کا قبیلہ ''سوری'' ہے۔اس طرح ان کا سلسلہ نسب شہاب الدین غوری اور شیر شاہ سوری سے جا ملتا ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

''براہوی اقوام کے بارے میں ڈینس برے کے بعد
میں نے لکھا۔حالاں کہ میرا تعلق لودھی خاندان کے قبیلہ
سوری سے ہے۔ہمارے جدامجد شیر شاہ سوری ہیں'' (۱)

رسالہ ''مسکراہٹ'' میں آغا گل اپنے جدامجد کے بارے میں یوں کہتے ہیں کہ:

''میں لودھی پٹھان ہوں'' (۲)

وراثت میں جو اوصاف انسان کو ملتے ہیں۔ان پر خاندانی اثرات ضرور نمایاں ہوتے ہیں۔آغا گل کا تعلق گو کہ سوری خاندان سے ہے مگر براہوی کلچر کے زیادہ قریب رہنے کے باعث اس سے زیادہ اثر پزیر ہوئے۔آغا گل کے والد محمد اکبر خان بلوچستان کے ممتاز ماہر تعلیم تھے۔محمد اکبر خان نے ملازمت کا آغاز محکمہ تعلیم برٹش بلوچستان میں ۱۹۳۹ء میں کیا۔آغا گل کی پیدائش کے وقت وہ ہیڈ ماسٹر ہرنائی اسکول کے عہدے پر فائز تھے۔اس کے بعد پھر ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز سبی مقرر کیے گئے۔محمد اکبر خان نے اپنی متاع حیات کے ۴۲ سال بلوچستان میں تعلیم کے لیے صرف کیے۔بلوچستان کے پس ماندہ علاقوں میں خدمات سرانجام دیں کوہلو، بارکھان اور مند میں سکول قائم کیے۔آغا گل اپنے والد کے بارے میں ایک غیر مطبوعہ سوانحی مضمون میں یوں لکھتے ہیں کہ:

''میرے والد نے جو کچھ لکھا وہ سنبھالا نہ جا سکا
کچھ ان سے ان کے اعلیٰ افسران نے مانگ لیا

جیسے بلوچستان کے جغرافیے کے بارے میں میرے
والد نے سب سے پہلے لکھا۔ان کے افسر نے بلوچستان
کا جغرافیہ نامی کتاب اپنے نام سے چھپوادی والد صاحب
صرف تعلقات کی بناء پر انکار نہ کر سکے۔میرے والد بلند
پایہء ادیب تھے ۔انہوں نے ہمیں گروہی لسانی تعصبات
سے بالاتر رکھا'' (۳)

محمد اکبر خان کو اللہ تعالی نے پانچ بچوں سے نوازا۔جن میں دو بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔سب سے بڑی بیٹی طاہرہ گل ہیں۔ان سے چھوٹی ظاہرہ گل ہیں۔بیٹوں میں سب سے بڑے بریگیڈئر آغا احمد گل ہیں۔جو سابق وائس چانسلر آف بلوچستان یونیورسٹی رہ چکے ہیں۔ان سے چھوٹے آغا انور گل ہیں جو پوسٹ ماسٹر جنرل سندھ بلوچستان(B-۲۱) ہیں۔اور سب سے چھوٹے آغا آصف گل ہیں۔جو ڈپٹی ڈائرایکٹر محکمہ تعلیم ہیں۔آغا گل کے بڑے بھائی بریگیڈئر آغا احمد گل بھی علم وادب سے تعلق رکھتے ہیں۔انہوں نے زریعہ اظہار کے لیے انگریزی زبان اختیار کی۔جبکہ آغا گل کی بہن ظاہرہ گل اردو،انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں۔اور سنسکرت زبان سے بھی شناسائی ہے۔

آغا گل نے جس گھر میں آنکھ کھولی وہ علم وادب کا گہوارہ تھا ان کو بچپن سے ہی ایسا ماحول میسر آیا کہ جس کی بنا پر وہ علم وادب سے تعلق استوار کیے بغیر نہ رہ سکے۔آغا گل نے ابتدائی تعلیم بارنس ہائی سکول سبی سے حاصل کی۔آغا گل جب زیارت کے پرائمری سکول میں زیر تعلیم تھے۔اس زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ تحریر کرتے ہیں کہ ایک بار چھٹی کے وقت دو مسیحی مشنری سفید گاؤن پہنے ہوئے سکول میں آئے۔چہرے مہرے سے انگریز دکھائی دے رہے تھے۔انہوں نے بچوں سے بہت سی باتیں کیں۔بچوں سے گھل مل گئے۔اور انھیں الگ الگ جلدوں میں متی،مرقس،لوقا،اور یوحنا کی اناجیل تحفۂ دیں۔رنگین سرورق پہ بھیڑوں کے ہمراہ ایک چرواہے کی تصویر تھی۔ یوں مسیحی مشریز سے مفت کتابیں ملنے پر بچے بہت خوش تھے۔

پادری مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہاں موجود کچھ لوگوں نے ان کے رخصت ہوتے ہی بچوں پر حملہ کر دیا اور ان سے کتابیں چھیننے لگے۔ اسی اثناء کچھ بچوں نے بستے اٹھائے اور گھروں کی جانب دوڑ لگادی۔

ان بچوں میں آغا گل بھی شامل تھے۔ گھر پہنچتے ہی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ والد محترم محمد اکبر خان کو ساری روداد سنائی۔ انہوں نے کتابیں الٹ پلٹ کے دیکھیں پھر فرمایا: پڑھو، ان میں نور اور ہدایت ہے۔ یہ اناجیل اربعہ ہیں۔ قدیم انگریزی میں انھیں GOODSPELL کہا جاتا تھا یعنی خوشخبری، کثرت استعمال سے یہ لفظ Godspell بن گیا۔ اپنے حصے کی لالٹین روشن کر کے آغا گل شام کو انا جیل پڑھنے لگتے اور انہوں نے اسے اتنی بار پڑھا کہ اس کے بہت سے حصے انہیں زبانی یاد ہو گئے۔ انہیں بائبل پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ یہی وجہ کہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں بائبل کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔ اپنی کتاب ''بلوچی بائبل کی تاریخ'' میں بائبل کے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

'' زندگی کی طویل راتوں اور جاڑوں اور پھیلی تنہائی
میں اکثر میں نے بائبل کو اپنا رفیق، مونس وغمخوار
پایا۔ میرا بائبل سے بہت پرانا رشتہ ہے، بائبل اور
ہم بچپن سے ساتھ ساتھ ہیں۔ صنوبر کے جنگلوں
میں جہاں شمشوب کی خوشبو بکھری رہتی ہے شام
اترتی تو میں بائبل پڑھنے بیٹھ جاتا'' (۵)

آغا گل چوتھی جماعت میں زیر تعلیم تھے۔ ان دنوں بلوچستان میں بجلی نہیں تھی۔ سڑکیں کچی تھیں دن بھر میں ایک مسافر بس کوئٹہ سے ڈاک لاتی، بیرونی دنیا سے یہی رابطہ تھا۔ لوگ باگ بس کو ہی ڈاک کہا کرتے۔ گھوڑے، اونٹ، بیل گاڑیاں سفر کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ آغا گل اپنے غیر مطبوعہ سوانحی مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ ہم نے کن حالات میں تعلیم حاصل کی۔
ہم پانچ بہن، بھائی تھے۔ اس دور میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج

نہیں تھا۔ مگر والدہ نے شدید سماجی مخالفت کے باوجود بہنوں
کو تعلیم دلوائی۔ ذرائع آمدورفت محدود تھے۔ اونٹوں اور گھوڑوں پر
سوار ہو کر سکول جایا کرتے" (۴)

آغا گل کے بچپن میں ان کے گھر کے ساتھ ایک ندی بہتی تھی۔ اور کچھ ہی فاصلے پر ایک ریلوے اسٹیشن بھی تھا۔ جہاں دخانی انجن چلتے تھے۔ آغا گل کو بچپن سے ریلوے اسٹیشنوں، ریل گاڑیوں اور دخانی انجنوں سے محبت سی ہوگئی جس پر بعد ازاں انہوں نے ریلوے کو بطور رومانی المیہ استعمال کیا جیسے کہ افسانہ "ھلی" (گھوڑا) اس افسانے میں دخانی انجن (Locomotive) کو گھوڑے کے مماثل قرار دیا گیا وغیرہ سے متعلق بیشتر افسانے اور ناول لکھے۔

پرائمری جماعتیں بیر کے درختوں تلے تعلیم حاصل کرتیں۔ گرمیوں کی آمد سے پہلے دفتر زیارت منتقل ہو جایا کرتے کہ سبی کا ڈسٹرکٹ کا محکمہ موسم گرما کا ہیڈ کوارٹر زیارت تھا۔ جیسا کہ آغا گل نے غیر مطبوعہ سوانحی مضمون میں لکھا ہے کہ:

"یہ colonial چونچلے ۱۹۷۰ء کی دہائی تک
چلتے رہے" (۶)

آغا گل کو پرائمری سے مڈل کلاس تک جو اساتذہ پڑھاتے رہے۔ ان کی کم علمی، قدامت پسندی اور جہالت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

" ہمارے اساتذہ زیارت زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔
مثلاً ان کا کہنا تھا کہ زمین گھومتی نہیں اسکول ایک روز
گھوم کر ڈھاڈر کے پاس جا نکلتا یا کسی روز کچھ لیاری میں
پڑا ملتا۔ زمین کے گول ہونے پر انہیں یقین نہیں تھا۔
فرماتے اگر زمین گول ہوتی تو بچے گر نہ پڑتے" (۷)

۱۹۵۰ء کی دہائی میں ایسے اساتذہ سردار چاکر رند کے دورِ حکومت میں زندہ تھے۔ زندگی اور حالات کے تقاضوں سے وہ کچھ زیادہ آگاہ نہ تھے۔ اس دور میں بلوچستان میں شاذ و نادر ہی بجلی پائی جاتی پورے شہر میں بجلی نہ تھی۔ صرف سڑک کے

کھمبے اور ریلوے اسٹیشن ہی بجلی حاصل کر پاتے بقول آغا گل:

"ہم لالٹین کی روشنی میں پڑھا کرتے سوائے
کتابیں پڑھنے کے اور کوئی تفریح نہ تھی سرِ شام
اپنے حصے کی لالٹین روشن کر کے افسانے پڑھنے
لگتا۔ پڑھنے کا عام رواج تھا پانچویں جماعت
میں وظیفے کا امتحان پاس کیا تو آٹھویں جماعت
تک ماہانہ وظیفہ ملنے لگا" (۸)

آغا گل کا تعلق چونکہ علمی و ادبی گھرانے سے تھا۔ ان کے گھر مختلف ادبی جرائد و رسائل آیا کرتے مثلاً فنون، ادب لطیف اور سیپ وغیرہ۔ مطالعہ آغا گل کا مشغلہ تھا۔ اور "ادبِ لطیف" نے ان کی ادبی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ جس کے باعث وہ پتنگ اڑانا، قینچے کھیلنا، نہ سیکھ پائے۔ حتیٰ کہ اس دور کا رومینٹک فیشن سموکنگ تھا۔ وہ بھی نہ اپنا سکے۔ بچپن سے اسکول کے دور تک آغا گل نے اردو ادب کے بڑے بڑے شاعر و ادیب پڑھ ڈالے اور ساتھ ساتھ انہیں لکھنے لکھانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ اس حوالے سے وہ اپنے غیر مطبوعہ سوانحی مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

"میں بچپن سے ہی لکھتا چلا آیا۔ مگر وہ ناپختہ، بچگانہ
تحریریں میں نے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیں
بلکہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں جو تحقیقی مضامین لکھے انہیں
اب تک نامکمل سمجھتا ہوں" (۹)

۱۹۶۵ء میں آغا گل نے اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ جس کے بعد انھوں نے ڈگری کالج کوئٹہ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے ۱۹۶۸ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بلوچستان یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ بلوچستان یونیورسٹی سے آغا گل نے اپنا پہلا ایم اے قومی زبان اردو میں کیا۔ آغا گل اپنے ایک سوانحی مضمون میں

اپنے یونیورسٹی اساتذہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"خوش قسمتی سے ہمیں کالج، یونیورسٹی میں بہت اچھے اساتذہ ملے۔
جن میں سید۔ایس خلیل، پروفیسر خلیل صدیقی، پروفیسر نبوت یار خان
پروفیسر کرار حسین، پروفیسر جلیل الرحمان، فرداً فرداً نام گنوانا بہت
مشکل ہے" (۱۰)

آغا گل نے ۱۹۷۶ء میں اپنا دوسرا ایم اے پولیٹیکل سائنس (سیاسیات) میں کیا۔اس کے بعد ۱۹۸۱ء میں ادب سے شغف ہونے کے باعث ایم اے انگریزی بھی کرلیا۔مگر ان کی تعلیم کا سلسلہ ابھی رکا نہیں تھا۔۱۹۸۳ء میں آغا گل نے قانون کی ڈگری حاصل کی۔آغا گل نے اپنا پہلا ایم اے ۱۹۷۲ء کرنے کے فوراً بعد ہی اپنی عملی زندگی کا آغاز بحیثیت لیکچرار کردیا تھا، کیونکہ ان کے والد معروف ماہر تعلیم محمد اکبر خان کا اصرار تھا کہ بلوچستان میں تعلیم پھیلانے کے جہاد میں بیٹے بھی شامل ہوں۔وہ فروغ تعلیم کو ایک قومی جذبہ کے طور پر لے رہے تھے۔علاوہ ازیں وہ اپنا ذاتی کاروبار قالین بافی اور کول مائنگ، بھی کرتے رہے ۱۹۷۲ء میں گورنمنٹ کالج مستونگ میں بطور لیکچرار تعینات ہوئے۔اور اس کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج سریاب میں بھی اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

۱۹۷۵ء کو آغا گل کے والدین نے شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔شادی کے بعد اللہ تعالی نے آغا گل کو تین بیٹیاں ظاہرہ گل، عنبر گل، نیلمبر گل اور ایک بیٹے سے نوازا۔آغا گل کے بیٹے آغا محمد طاہر گل آرمی میں بطور میجر پائیلٹ ملازمت کررہے ہیں۔

گورنمنٹ مستونگ کالج اور گورنمنٹ سریاب کالج کے بعد آغا گل بلوچستان یونیورسٹی میں چلے آئے۔
لبنیٰ ملک اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

"بلوچستان یونیورسٹی میں آغا گل زیادہ دیر
ٹھہر نہ سکے، انھیں بلوچستان یونیورسٹی کے

صدر شعبہ اردو پروفیسر مجتبیٰ حسین کے ساتھ

اختلافات ہو جانے کے بعد مستعفی ہونا پڑا

-------" (۱۱)

یونیورسٹی سے مستعفی ہو جانے کے بعد آغا گل نے گورنمنٹ سائنس کالج کوئٹہ میں لیکچرر کے عہدے پر فائز ہو کر درس و تدریس شروع کر دی۔ جن دنوں آغا گل گورنمنٹ کالج میں تدریس کے ساتھ ساتھ کالج کے ادبی مجلے میں بطور مدیر بھی فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ انہوں نے ایک مختصر سا مضمون "بلوچی بائبل" تحریر کیا۔ پرنسپل اور دیگر ساتھیوں نے مضمون شائع کرنے سے منع کر دیا۔ یہ تکرار اتنی بڑھی کہ آغا گل نے ایڈیٹر شپ سے معذرت چاہی بقول آغا گل:

" جس رسالے کا ایڈیٹر اپنا ہی تحریر کردہ مضمون

شائع نہ کر سکتا ہو اسے ایڈیٹر شپ کا کوئی حق

نہیں پہنچتا صرف میرا نام بطور ایڈیٹر چھاپنے

سے کیا ہوگا" (۱۲)

ازاں بعد نہایت محنت سے مضمون لکھ کر اردو ڈائجسٹ کو بھجوایا۔ ایک ماہ بعد انہوں نے بھی یہ مضمون پر شفقت خط کے ہمراہ لوٹا دیا۔ اور تاکید کی کہ کسی اور موضوع پر لکھ کر بھجوایئے۔ ایسے ذہنی رویوں کے باعث کالجوں میں دانشور نہیں بلکہ اوٹ لگے گھوڑے پیدا ہو رہے ہیں۔ جنہیں دائیں بائیں دیکھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ سات سال تک مختلف اداروں میں فرائض انجام دینے والے ادیب آغا گل تعلیمی نظام سے مطمئن نہیں تھے۔ جس کی بناء پر اس شعبے کو خیرباد کہہ دیا۔ ۱۹۷۹ء میں آغا گل نے سی ایس ایس کا امتحان دیا۔ اور بیوروکریسی کی دنیا میں قدم رکھا۔ ۲۰۱۲ء پاکستان پوسٹ میں ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ آغا گل کو شاعری سے بھی شغف رہا ہے۔ کشور کمار ان کے پسندیدہ گلوکار ہیں۔ جس دن کشور کمار فوت ہوئے وہ غم کے باعث دفتر نہیں جا سکے۔ اس کے علاوہ محمد رفیع اور ہیمنت کمار اور ایس ڈی برمن کے گانے بھی شوق سے سنتے ہیں۔ عرب موسیقی کا بھی ایک بڑا ذخیرہ انکے پاس موجود ہے۔ آغا گل سپورٹس کاریں چلانے کے

بھی شوقین ہیں۔اس شوق کی تکمیل کے دوران ایک بار شدید زخمی ہوئے تھے۔اس حوالے سے شازیہ شاہانہ ایڈووکیٹ بلوچستان ہائی کورٹ''ماہنامہ روشناس،آغا گل نمبر''میں لکھتی ہیں کہ:

''آغا گل سے تعارف بڑے عجیب حالات میں ہوا
کولپور کے قریب دشت میں اس کی نیلی پجارو الٹی
پڑی ہوئی تھی۔ہم جلدی سے رکے وہ بھی کھڑکی
کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے رینگ کر باہر نکل آیا،ان
کے ہمراہ تین افراد اور بھی تھے،سبھی زخمی تھے،اسے
سینے اور پسلیوں پر چوٹیں لگیں تھیں۔۔۔۔۔۔ہم نے
فوراً اسے کوئٹہ لے جانا چاہا،کیونکہ گاڑی کی صرف ایک
سیٹ خالی ہوسکی تھی مگر اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ
پکڑے انکار کردیا،''میں ان ساتھیوں کو اکیلا چھوڑ کر
نہیں جاسکتا''۔۔۔۔۔۔ (۱۳)

حادثات کے باوجود یہ شوق ابھی تک برقرار ہے۔فلمیں بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔یہ شوق ابھی تک برقرار ہے۔ فلمیں بہت شوق سے دیکھتے ہیں،خصوصاً انگریزی فلمیں۔Troy اور Lord of the ring ان کی پسندیدہ فلمیں ہیں۔ان کا کہنا ہے پاکستان میں صرف رومانی فلمیں بنانے کی اجازت ہے۔کوئی نظریاتی فلم نہیں بنا سکتا۔

آغا گل نے بے شمار ناول،افسانے لکھے۔نمود مسلم اور لبنی ملک کی تحقیق کے مطابق آغا گل کو مختلف اعزازات سے نوازا گیا مثلاً جن میں ایوارڈ برائے''آکاش ساگر''انڈیا کے نامور ادیب نند کشور وکرم نے افسانہ''دوسری بابری مسجد''کو بہترین عالمی ادب ۱۹۹۲ء قرار دیا گیا۔جبکہ راقمہ کی تحقیق کے مطابق انہیں کسی قسم کے اعزاز سے نہیں نوازا گیا۔ کیونکہ وطن عزیز میں سفارشوں اور لابنگ سے انعامات،اعزازات ملتے ہیں۔جبکہ آغا گل کے پاس نہ تو لابنگ کے لیے وقت ہے اور نہ ہی ایسا ذہن ہے۔ان کے بقول بندر بانٹ کے باعث سرکاری تمغوں کی بے توقیری ہوتی آئی ہے۔

عبدالعزیز ورجینا اور زاہدہ حنا جیسے تخلیق کاروں نے تمغہ امتیاز لینے سے انکار کر دیا تھا۔ جبکہ پروفیسر نادر قمبرانی کو زبردستی تمغہ امتیاز دیا گیا تو انہوں نے واپس ہتھے مارا۔ ادبی دنیا میں البتہ ان کے تخلیقی کام کو سراہا گیا۔

معروف ادیبہ قرۃ العین حیدر نے بھی آغا گل کے افسانوں کی تحسین کی ہے۔

صوبائی سطح پر آغا گل کی بلوچستان کی تاریخ پر اردو اور انگریزی میں تحقیقی مضامین کا سلسلہ جاری ہے۔

ڈاکٹر انور سجاد نے انہیں عہد حاضر کے تین بڑے افسانہ نگاروں میں شمار کیا ہے۔

آغا گل کے منتخب افسانوں کا پنجابی ترجمہ ''روپ سروپ'' کے عنوان سے ایڈووکیٹ کلیم شہزاد نے کیا۔ جو ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔

آغا گل کے افسانوی مجموعہ (راسکوہ) کا براہوی ترجمہ میر صلاح الدین مینگل ایڈووکیٹ جنرل بلوچستان نے خلیجاء (چیتا) کے عنوان سے کیا۔ خلیجاء ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔

''انتخابِ گل'' کے عنوان سے آغا گل کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ۲۰۰۵ء میں انڈیا سے شائع ہوا۔

نمود مسلم، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اردو' آغا گل کی افسانہ نگاری ''گورپج'' کے حوالے سے، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویج اسلام آباد ۲۰۰۵ء

بہ عنوان'' آغا گل کے افسانوں کی دنیا اب تک ۔۔۔'' طفیل اختر کی کاوش ہے۔ جسے ۲۰۰۸ء میں لاہور سے شائع کیا گیا۔

لبنی ملک، تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اردو'' آغا گل کی ناول نگاری'' نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد ۲۰۰۸ء میں پیش کیا گیا۔

ماہنامہ روشناس کراچی نے'' آغا گل نمبر'' جلد نمبر ۱۴ شمارہ نمبر ۶، نومبر ۲۰۱۱ء میں شائع کیا گیا۔

آثار:

آغا گل کی شخصیت اور ادب میں ان کا مقام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وہ بلوچستان کی دور افتادہ وادیوں سے نمودار ہوئے۔ آغا گل کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ آغا گل کے والد محمد اکبر خان محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ کم سن آغا گل کو مطالعہ کے ساتھ ساتھ لکھنے کا بھی شوق تھا۔ یعنی لکھنے کا عمل زمانہ طالب علمی سے ہی شروع ہو گیا۔ وہ پانچویں جماعت میں تھے جب ان کی پہلی تحریر شائع ہوئی۔ بچپن پہاڑوں اور صحراؤں میں گزرا جس کا واضح اثر ان تحریروں میں نظر آتا ہے۔ آغا گل گھر کے علمی و ادبی ماحول کی وجہ سے کتب بینی کی طرف مائل ہو گئے۔ سکول کے زمانے میں انہوں نے نامور اہل قلم کی تحریریں پڑھ ڈالیں۔ بطور ادیب آغا گل کی اب تک ۱۳ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں ناول، افسانے اور دیگر متفرق موضوعات پر کتب ہیں۔ اپنی دلکش تحریروں کی وجہ سے بہت جلد اردو قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ گل و بلبل کے روایتی موضوعات کو اپنانے کے بجائے انہوں نے انسانی جذبات کی عکاسی کو ترجیح دی۔

آغا گل کے افسانوں سے متعلق ان کے فکر و فن پر طفیل اختر نے ایک کتاب ''آغا گل کے افسانوں کی دنیا اب تک ۔۔'' لکھی۔ اس کتاب میں آغا گل کی افسانہ نگاری سے متعلق مختلف لوگوں کی آراء جن میں قرۃ العین حیدر، راجا رسالو ، ڈاکٹر خیال امروہی، ڈاکٹر انور سدید، غلام نبی اعوان، آغا امیر حسین،، اصغر عابد، اور خود طفیل اختر کی آراء شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آغا گل کا انٹرویو، ان کے طفیل اختر کو لکھے ہوئے خطوط اور آغا گل کے افسانوں کے مختلف حصے شائع کیے گئے ہیں۔ ''صحرا کی ہتھیلی پہ دیا'' آغا گل کی منتخب نثری تخلیقات کا تنقیدی جائزہ) آسناتھ کنول کی آغا گل پر تنقیدی کتاب ۲۰۱۲ء میں منظر عام پر آئی ہے۔

آغا گل کی پہلی کتاب ''دشتِ وفا'' ۱۹۸۲ء کو منظرِ عام پر آئی۔ اس ناول کو ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔ بلوچستان کا پہلا ادبی ناول ''دشتِ وفا'' تھا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ان کے مختلف ناول جن میں ''بابو''، ''بیلہ'' شامل ہیں۔ اور افسانوی مجموعے جن میں گورپچ، آکاش ساگر، مہر گڑھ، گوانگو، راسکوہ، پرتھوی غوری، ڈاک پہ ڈاکہ، شائع ہوئے۔

اہلِ بیت سے محبت کے باعث متعدد کتابیں مرتب کیں۔ جن میں شدومرجان، پارس لفظیں، حضرت علی کی پیشن

گوئیاں، شامل ہیں۔آغا گل نے ''بلوچی بائبل کی تاریخ'' بھی مرتب کی۔تقریباً ۵۰ کے قریب تحقیقی مقالے، جوزیادہ تر انگریزی زبان میں مختلف ادبی رسائل کے لیے لکھے گئے۔ان کی درج ذیل تصانیف کے بلوچی اور براہوی زبان میں تراجم کیے گئے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱) آزمان سوزین ساوڑ (بلوچی) مترجم، غوث بخش صابر

۲) مہرگڑھ (براہوئی)، مترجم، پروفیسر سوسن براہوی

۳) مہارہ تارہ (براہوئی)، مترجم، پروفیسر سوسن براہوئی

۴) خلیجہ (براہوی)، مترجم میر صلاح الدین مینگل

۵) گٹوگ (براہوئی)، ترجم، نادر شہوانی

۶) بیلہ (براہوئی) مترجم، پروفیسر سوسن براہوئی

۷) آغا گل روایت آتاباغی، پروفیسر سوسن براہوئی

گورپچ:

بلوچستان کے اہم افسانہ نگاروں میں ایک نام آغا گل کا ہے۔معروف افسانہ نگار نسیم درانی (ایڈیٹر سیپ) نے تو آغا گل کو بلوچستان کا پہلا اور آخری افسانہ نگار قرار دے ڈالا۔ آغا گل کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گورپچ'' ہے۔جو ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ افسانوی مجموعے کے طور پر پہلی مرتبہ ڈاکٹر منہاج الدین نے ''دی ٹائمز پریس' پرائیوٹ لمیٹڈ، کراچی نے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا۔س افسانوی مجموعے کے تمام افسانے ماسوائے افسانہ ''گورپچ'' کے، اس مجموعے کے توسط سے پہلی بار منظرِ عام پر نہیں آئے۔جن میں ٹرن ٹیبل، صاک خانہ کلکڑ، دوسری بابری مسجد، کباڑی بازار، اسپیڈ بریکر، وادی قاف، کورہ کئی، روپے کا جن، دھوپ کی چادر، جبر اور گورپچ شامل ہیں۔اس سے قبل کراچی، کوئٹہ، لاہور کے موقر ادبی جریدوں میں چھپے ہیں۔آغا گل کے اس افسانوی مجموعے کا انتساب چونکا دینے والا ہے۔انہوں نے اپنے اس

مجموعے کو ''اپنے خوابوں کے نام کیا'' اور ساتھ ایک شعر لکھا

؎ شب پرستو، درامکاں سحر بند کرو

مجھ سے پہلے میرے خوابوں کو نظر بند کرو

گوریچ کے حوالے سے ''پرفیسر مبارکہ حمید'' گرلز کالج کوئٹہ اپنے مقالے ''بلوچستان میں اردو افسانے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' میں لکھتی ہیں:

'' آغا گل کے افسانوں کا مجموعہ ''گوریچ'' بہت ہی دلچسپ

اور چونکا دینے والا افسانوی مجموعہ ہے'' (۱۴)

آغا امیر حسین ''ماہنامہ روشناس، آغا گل نمبر'' میں گوریچ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''گوریچ میں آغا گل کا فن عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ ان

کا کرافٹ قابلِ داد ہے۔۔۔۔۔'' (۱۵)

آغا گل کا یہ افسانوی مجموعہ بلوچستان یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب میں شامل ہے۔ نمود مسلم نے بھی آغا گل کے افسانوی مجموعہ ''گوریچ'' پر ۲۰۰۴ء ایم اے کی سطح پر تحقیقی مقالہ لکھا۔

۲) آکاش ساگر:

آغا گل کا دوسرا معروف، ادبی ایوارڈ یافتہ افسانوی مجموعہ ''آکاش ساگر'' ۱۶ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس افسانوی مجموعے کو کلاسیک سپوتنک پرنٹرز نے فروری ۲۰۰۹ء میں شائع کیا۔ ''آکاش ساگر'' جس کا پیش لفظ بھی مصنف کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ پیش لفظ میں اکثریت ایسے فقروں کی ہے جو اقوال کے زمرے میں آتے ہیں۔ آکاش ساگر کے افسانوں میں اندھا دن، جادوگر، پوغٹ، پرتھوی غوری، بازگشت، گنوک، کھلی والا، آکاش ساگر، خانہ مستانہ، پودبندغ، مٹی بکتی ہے، ایڈکولیم، سرکک، کبی، استاد مہر، ہابیل قابیل شامل ہیں۔ ضیاء حسن ضیاء ''آکاش ساگر'' کے حوالے سے لکھتے

ہیں کہ:

"آکاش ساگر کے تمام افسانے بلوچستان کے پس منظر میں
لکھے گئے ہیں۔ ان کے زمان ومکاں اور کردار بلوچستان
ہی سے تعلق رکھتے ہیں" (۱۶)

۳) راسکوہ

"راسکوہ" آغا گل کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس افسانوی مجموعے میں ۱۴ افسانے ہیں۔ اس افسانوی مجموعے کو مکتبہ الحمراء نے نومبر ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔ اس مجموعے کے افسانوں میں تارمہ، دیوغالب، راسکوہ، مطالبہ، ساتھی، پتھر، شودر، طلسمی روٹی، سگ زرد، لومڑی شاہزادی، گردنر، حقوق، فدوہ، اور نیا دیس شامل ہیں۔ راسکوہ ایک بہت بے پہاڑ کا نام ہے۔ "راسکوہ" کے پیش لفظ میں آغا گل لکھتے ہیں کہ:

"بچپن میں خوبصورت، خوش رنگ، نرالے نقش ونگار کے
پتھر جمع کرنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔۔۔۔۔رفتہ رفتہ علم ہوا
کہ انسانوں کے اندر بھی پتھر ہیں۔۔۔۔" (۱۷)

۴) مہر گڑھ:

"مہر گڑھ" آغا گل کا چوتھا معروف افسانوی مجموعہ ہے۔ ۱۸۷ صفحات پر مشتمل اس افسانوی مجموعے میں "۱۹" افسانے ہیں۔ جن میں پرندہ، فرح شناسی، عیدی، چاخو، دل سے نکال کر دینا، ایڈکولیم، کسبی، استاد مہر، ہابیل قابیل، زبان ور، سواگت، قراقلی، دودھ پتی پیاز، باؤ، ترپاہٹ، پاولی، مہر گڑھ، اور پروانہ شامل ہیں۔ اس افسانوی مجموعے میں "مہر گڑھ" کو دعا حق پبلی کیشنز نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔ "مہر گڑھ" آغا گل کے علمی وادبی وتاریخی مطالعے کا عکاس ہے۔ "مہر گڑھ" میں شامل چند افسانے جن میں ایڈکولیم، کسبی، استاد مہر، ہابیل قابیل، اس سے قبل آغا گل کے

دوسرے افسانوی مجموعے'' آکاش ساگر'' میں شامل ہیں۔

۵) گوانگو:

آغا گل کا پانچواں افسانوی مجموعہ'' گوانگو'' ہے۔۱۳۹ صفحات پر مشتمل اس افسانوی مجموعے میں ''۱۳'' افسانے ہیں۔جنہیں ادارہ ماہنامہ الحمراء لاہور کے زیرِ اہتمام ہاشم اینڈ حناد پرنٹرز نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔زیرِ نظر افسانوی مجموعے میں درج ذیل افسانے جیسے فدوا، ڈریکولا، رموز زباں، انقلاب، کوئٹہ میں ہاتھی، ڈاک پہ ڈاکہ، غیرتی، ڈاک اور حجامت، مجاہد اعظم، محلّہ بلیماراں، بوانٹو، گوانگو، شامل ہیں۔گوانگو میں شامل افسانہ ''فدوا'' اس سے قبل آغا گل کے تیسرے افسانوی مجموعے ''راسکوہ'' میں شائع ہو چکا تھا۔''دیپک پدکی''، سیپ شمارہ ۸۰، میں آغا گل کا افسانوی مجموعہ'' گوانگو''۔۔۔ایک تجزیہ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''افسانوی مجموعہ'' گوانگو'' کے افسانوں میں اکثر و بیشتر محکمہ ڈاک اور ڈاک ملازمین سے تعلق رکھتے ہیں۔جیسے ڈریکولا، انقلاب، ڈاک پہ ڈاکہ۔۔۔افسانہ نگار نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ڈاک کے محکمے میں گزارا ہے۔اس لیے یہ محکمہ انکی سانسوں میں رچا بسا ہے۔۔۔'' (۱۸)

۶) پرتھوی غوری:

آغا گل کا چھٹا افسانوی مجموعہ ''پرتھوی غوری'' ہے۔جسے اس سے قبل وہ آکاش ساگر کے نام سے شائع کرا چکے ہیں۔بقول آغا گل:

> '' آکاش ساگر کو پرتھوی غوری کے نام سے شائع کرنا میرے پبلیشر کی خواہش تھی'' (۱۹)

زیرِ نظر افسانوی مجموعے میں تمام افسانے وہی ہیں جو'' آکاش ساگر'' میں منظرِ عام پر آ چکے تھے۔جن میں دوسری بار بری

مسجد، اندھادن، جادوگر، پرتھوی غوری، بازگشت، گنوک، کھلی والا، آ کاش جاگر، پوغٹ، خان مستانہ، پووبندع، مٹی بکتی ہے، سرکک شامل ہیں۔اس افسانوی مجموعے کو رنگِ ادب پبلی کیشنز کراچی نے مارچ ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔

۷) پرندہ:

پرندہ آغا گل کا ساتواں افسانوی مجموعہ ہے۔مہردار انسٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز نے فروری ۲۰۱۲ء کو شائع کیا۔اس مجموعے کو انہوں نے اپنے GOD Father جن کا نام اکبرخان کاکڑ کے نام منسوب کیا۔جن کے بارے میں آغا گل لکھتے ہیں کہ

who resigned against abrogation of constitutio

declaration of one unit and military action in

balochistan

(۲۰)

اس مجموعے کے بارے میں اظہر جاوید، انے ۲۵ جنوری ۲۰۱۲ء ''وہ ایک عجیب شخص'' کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔اسی طرح ''ایک رائے'' کے عنوان سے سرور سیکھرا، ایڈیٹر 'دھنک' نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔آغا گل نے انہیں اپنے زیرِ نظر مجموعے میں شامل کیا۔اس مجموعے میں کل گیارہ افسانے ہیں۔جن میں بدروچ، انقلابی شاعر، بولتے سناٹے، چاخو، پیاز، چیدغ، پرندہ، پادلی، قبرستان کی موت، گونگا پہاڑ، مہرگڑھ، اجنبی شامل ہیں۔چار افسانوں جن میں بدورچ، قبرستان کی موت، بولتے سناٹے، گونگا پہاڑ کے علاوہ باقی سب پہلے مجموعوں میں چھپ چکے ہیں۔گزشتہ صفحات میں آغا گل کے افسانوی مجموعوں کا فرداً فرداً سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔اسی طرح آ ثار میں ہم ان کے ناولوں کا سرسری جائزہ پیش کریں گے۔

ناول:

۱) دشتِ وفا:

اکیسویں صدی میں بلوچستان کا پہلا ناول آغا گل کا ''دشتِ وفا'' ہے۔ ''دشتِ وفا'' کو ۱۹۸۲ء میں سپوتنک پرنٹرز لاہور نے شائع کیا ہے۔ ناول کا نام عطا شاد کے اس شعر سے اخذ کیا گیا ہے۔

دشت میں سفر ٹھہرا، پھر میرے سفینے کا
میں نے خواب دیکھا تھا برف کے پگھلنے کا

''دشتِ وفا'' کو آغا گل نے اپنے بیٹے کیپٹن آغا محمد طاہر گل کے نام کیا اور ساتھ ایک شعر بھی لکھا کہ:

کوہساروں کی عطا رسم نہیں خاموشی
رات سو جائے تو بہتا ہوا چشمہ بولے

ایڈیٹر محمد مصلح الدین نے ''ماہنامہ روشناس''، آغا گل نمبر، میں ''دشتِ وفا'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''ان کے ناول ''دشتِ وفا'' میں روسی ناول نگار نکولائی گوگول کے اثرات ملتے ہیں۔ یہ ناول ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ہونے والے مسلح تصادم کی کہانی سے متعلق ہے۔۔۔۔'' (۲۱)

۲) بیلہ:

آغا گل کے ہر افسانوی مجموعے یا ناول کی طرح زیرِ نظر ''بیلہ'' بھی بہت مشہور و معروف ہے۔ ناول ''بیلہ'' کو قلات پبلیشرز نے ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔ اس ناول کا فلیپ آغا گل کے بڑے بھائی بریگیڈیئر آغا احمد گل سابق وائس چانسلر آف بلوچستان یونی ورسٹی کا لکھا ہوا ہے۔ وہ ''بیلہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

Bela is an epic tragedy,in regionalism.Agha gul is essentionally an impressionist. (22)

TH-13128

ناول ''بیلہ'' کے حوالے سے محمد عابد ''ماہنامہ روشناس آغا گل نمبر'' میں ''بیلہ کا ریمانڈ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ناول ''بیلہ'' بنیادی طور پر طبقاتی جنگ اور بلوچستان کی عصری

تاریخ پر مبنی ہے۔۔۔۔۔'' (۲۳)

۱۸ نومبر ۲۰۰۸ء میں ناول ''بیلہ'' کا ریمانڈ برطانوی خفیہ ایجنسی (ایم آئی ٦) کے اہلکاروں نے لیا۔لیکن دورانِ تحقیق انہیں کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں ملی۔''بیلہ'' کا براہوئی ترجمہ پروفیسر سوسن براہوئی نے ''ہیل'' کے نام سے کیا۔

۳) بابو:

آغا گل کا تیسرا بڑا ناول ''بابو'' ہے۔بابو کو آغا گل نے اپنے بھتیجے سکوارڈن لیڈر'' آغا مہر گل'' کے نام سے منسوب کیا۔اور ساتھ ہی ایک شعر بھی درج کیا ہے

؎ اظہار حق ہے آج بڑا سخت مرحلہ

ہے حوصلہ تو آؤ میرے ساتھ دار تک

ناول ''بابو'' کورنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی نے جنوری ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔اس ناول میں آغا گل بلوچی، براہوی، اور پشتو کے الفاظ و محاورے جابجا استعمال کیے ہیں۔ناول ''بابو'' کوئٹہ کی زبان میں یعنی کوئٹہ کی اردو میں تحریر ہوا۔اسی لیے اس ناول کے آخر میں ایک سو ایک ،۱۰۱ الفاظ کی فرہنگ بھی لگادی ہے۔ شاہد علی خان ناول ''بابو'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

'' بابو، کوئٹہ کی اردو میں لکھا گیا ہے۔اور یہ اردو محض بولی جاتی ہے

کبھی کسی نے اسے تحریری شکل دینے کی ہمت نہ کی۔آغا گل کا

ناول ''دشتِ وفا'' اور ''بابو'' بنیادی طور پر picaresque novel

ہیں۔ایسے ناولوں کے ہیرو کسی مروجہ ضابطہ اخلاق کے پابند

نہیں ہوا کرتے۔عرفِ عام میں انہیں بدمعاش کہا جاتا ہے۔'' (۲۴)

بلوچی بائبل کی تاریخ:

آغا گل نے ' بلوچی بائبل کی تاریخ پر ایک تحقیقی کتاب لکھی۔ آغا گل نے یہ کتاب بیس صدیوں سے بلوچستان میں رضا کارانہ اور بلا معاوضہ طبی خدمات انجام دینے والے مسیحی مبلغین کے نام معنون کیا ہے۔ جو مقدس تھومار رسول کے زمانے سے بشارتی کام کرتے چلے آئے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں کوئٹہ میں مشن ہسپتال قائم کر کے مفت طبی خدمات انجام دینے لگے جن میں ڈاکٹر سمر ہائیز اور ڈاکٹر سر ہنری ہالینڈ نمایاں ہیں۔ ان کے بعد ان کا بیٹا ڈاکٹر روفی ہالینڈ بلوچستان میں طبی خدمات انجام دیتا رہا۔ آغا گل کی اس کتاب کو مکتبہ ''شاداب'' ائیر ریکس پرنٹرز، میکلورو ڈ ،لاہور نے ۲۰۱۰ء میں شائع کیا۔ آغا گل نے اپنے ایک غیر مطبوعہ سوانحی مضمون میں اس حوالے سے لکھا ہے کہ:

'' مسیحی برادری اور ہندووں کے بارے جو کچھ لکھتا ہوں،
ذاتی تعلقات، تجربات کی بنیاد پر، لکھا۔ شریمد بھگوت
گیتا کا انگریزی ترجمہ کیا۔۔۔۔'' (۲۵)

آغا گل بائبل بچپن سے پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ مسیحی دراصل بلوچستان کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ بلوچستان کیلئے ان کی طبی خدمات قابلِ قدر رہی ہیں۔ مسیحی سرجنوں نے بلوچستان میں تقدیر کے تصور کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس لیے وہ ایسا غیر ارادی طور پر لکھتے ہیں۔ ہندووں پر ان کا افسانہ ''بابری مسجد'' اور مسیحوں پر افسانے ''ہابیل قابیل، قبرستان کی موت، ٹرن ٹیبل، پروانہ، نیت، وغیرہ ہیں۔ ڈاکٹر کنول فیروز نے اس کتاب کا فلیپ لکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

' بلوچی بائبل کی تاریخ'' آغا گل کی تحقیق و تالیف کا ایک
ایسا کارنامہ ہے۔ جسے کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا، ان کی
کاوش آنے والی نسلوں کے لیے بطور ریفرنس بک کام آتی
رہے گی'' (۲۶)

حوالہ جات:

۱) طفیل اختر، ایڈیٹر ماہنامہ ''مسکراہٹ، لاہور، ص۱۲ ۲۰۱۲ء

۲) ایضاً

۳) آغا گل غیر مطبوعہ سوانحی مضمون، ص۵

۴) ایضاً

۵) ایضاً

۶) ایضاً

۷) ایضاً

۸) ایضاً

۹) ایضاً

۱۰) ایضاً

۱۱) لبنیٰ ملک، آغا گل کی ناول نگاری'' مقالہ برائے ایم اے اردو، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص۱۹

۱۲) ایضاً

۱۳) شازیہ شاہانہ، آغا گل نمبر، ماہنامہ روشناس، ص۱۸

۱۴) مبارکہ حمید، ''بلوچستان میں اردو افسانے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، اوپن لائبریری، ۱۹۹۸ء، ص۶۷

۱۵) آغا امیر حسین، ''ماہنامہ روشناس''، آغا گل نمبر، جلد نمبر ۶، نومبر ۲۰۱۱ء، ص۲۷

۱۶) ضیاء حسن ضیاء، ''ماہنامہ روشناس''، آغا گل نمبر، جلد نمبر ۶، نومبر ۲۰۱۱ء، ص۲۸

۱۷) آغا گل، ''رااسکوہ''، مکتبہ الحمرا لاہور، ۲۰۰۲ء

۱۸) دیپک بدکی، ''افسانوی مجموعہ''، گوانگو''، سیپ شمارہ ۸۰، دہلی

۱۹) آغا گل غیر مطبوعہ سوانحی مضمون، ص۴

۲۰) آغا گل، ''پرندہ''، مہر دار پبلی کیشنز، فروری ۲۰۱۲ء، لاہور

۲۱) محمد مصلح الدین، ماہنامہ روشناس، آغا گل نمبر، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۷

۲۲) آغا گل، ''بیلہ'' ۲۰۰۶ء، ادارہ الحمراء، لاہور، ص ۸

۲۳) محمد عابد، ''ماہنامہ روشناس''، آغا گل نمبر، جلد نمبر ۶، نومبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۹

۲۴) شاہد علی خان شاہد، 'ماہنامہ روشناس''، آغا گل نمبر، جلد نمبر ۶، نومبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۸

۲۵) آغا گل، غیر مطبوعہ سوانحی مضمون، ص ۷

۲۶) آغا گل، ''بلوچی بائبل کی تاریخ''، مکتبہ شاداب ایئر ریکس پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۰ء

باب دوم:

اردو ناول نگاری کی روایت

ناول کی تعریف:

ناول اطالوی زبان کا لفظ ہے۔ جو انگریزی سے اردو میں آیا ہے۔اس کے معنی انوکھا، نرالا، عجیب کے ہیں۔اصطلاح میں ناول وہ قصہ یا کہانی ہے جس کا موضوع انسانی زندگی ہو اور ناول نگار زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مکمل اور گہرا مشاہدہ کرے اور پھر اپنے تجربات و مشاہدات کو ایک خاص سلیقے سے کہانی کی صورت میں پیش کرے۔ناول میں سب سے اہم چیز حقیقت نگاری ہے۔ ناول کی تعریف کے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف آرا ہیں۔

پروفیسر دھارٹن کے نزدیک:

''ناول ایک ایسے قصے کا بیان ہے جس میں ایک پلاٹ ہو'' (۱)

سر والٹر ایلے کہتے ہیں:

''ناول وہ ہے جس کا موضوع روزانہ زندگی ہے اور جس کا ذریعہ حقیقت نگاری ہے'' (۲)

فیلڈنگ نے کہا:

''ناول نثر میں ایک طربیہ کہانی ہے'' (۳)

ناول کے کچھ عناصر یعنی لوازمات بھی موجود ہیں جن کا جاننا ضروری ہے۔جن میں ناول کے مختلف عناصر شامل ہیں۔فنی اعتبار سے مندرجہ ذیل عناصر ہیں جو ناول کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ناول کے اجزا درج ذیل ہیں۔

۱) کہانی ۲) پلاٹ ۳) نظریہ حیات، نقطہ نظر ۴) کردار ۵) اسلوب بیان ۶) مکالمہ ۷) منظر نگاری

کہانی ناول کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ سب سے پہلے ناول نگار کے ذہن میں ایک خیال بننا شروع ہوتا ہے۔ پھر بعد میں یہ خیال قصے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔یوں ایک کہانی ترتیب پاتی ہے۔

پلاٹ انگریزی زبان کا لفظ ہے۔اس سے مراد وہ ذہنی خاکہ ہے جو ناول نگار کہانی کے متعلق آغاز، تعمیر، اور مختلف واقعات کی ترتیب ان کے اتار چڑھاؤ اور تکمیل خاتمہ کے متعلق اپنے طور پر بناتا ہے۔

پلاٹ اور نقطہ نظر آپس میں گہرا ربط رکھتے ہیں۔کوئی بھی ناول نگار ناول کسی نہ کسی مقصد کے پیش نظر ہی لکھتا ہے۔وہ مقصد تفریحی، اقتصادی، اخلاقی، مذہبی یا سیاسی جو بھی ہو اس فنکاری کے ساتھ بیان کیا جائے کہ ناول کی ادبی اور فنی سطح برقرار رہے۔

ناول کا اہم عنصر کردار ہیں۔کوئی بھی قصہ یا کہانی کرداروں کے بغیر تشکیل نہیں دی جاسکتی۔کرداروں کے حرکت و عمل سے کہانی آگے بڑھتی ہے اور اختتام کی حد کو چھوتی ہے۔ناول میں دو طرح کے کردار ہوتے ہیں۔۱) بنیادی کردار ۲) ضمنی کردار بنیادی کردار وہ ہوتے ہیں جن سے کہانی وجود میں آتی ہے۔ضمنی کردار وہ ہوتے ہیں جن سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔

اسلوب بیان سے مراد بات کہنے کا ڈھنگ اور تحریر کا طرز ہے۔اسلوب کی خوبی کی وجہ سے ایک ناول اعلیٰ شاہکار بھی بن سکتا ہے۔اس لیے مشاہدے کا قوی، مطالعے کا وسیع اور فن کا ماہر ہونا ضروری ہے۔

ناول کی ایک اہم خوبی مکالمہ ہے۔یہ ناول نگار کے ہاتھ میں اظہار کا بہترین آلہ ہے اپنے کرداروں سے جو کچھ جس قسم کے الفاظ چاہے ادا کرا سکتا ہے۔ مکالمے کردار کی حیثیت کے مطابق سنجیدہ، عالمانہ اور برجستہ ہونے چاہیں تا کہ ناول میں عالمانہ وقار برقرار رہ سکے۔

ناول میں منظر نگاری کے مرقع بھی ملتے ہیں۔اس کی وجہ سے زمان و مکان کا تعین ہوتا ہے۔منظر نگاری میں جہاں تک ہو سکے حقیقت کو پیش کیا جائے۔بے جا لفاظی قاری کو متاثر نہیں کر سکتی بلکہ اس سے ناول کا اثر کم ہو جاتا ہے۔کیونکہ کوئی بھی منظر کرداروں کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے نہ کہ محض صبح، شام، گرما سرما کی تصویر کشی کے لیے۔گویا کسی بھی منظر کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ کرداروں پر روشنی ڈالے بلکہ ایک نئے روپ میں پیش کرے۔

ناول کی اقسام:

ناول کی کئی اقسام ہیں۔ناول اپنے موضوعات، کہانی کی نوعیت اور کرداروں کے ارتقاء کے نقطہ نظر سے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ان میں سے درج ذیل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

۱) کرداری ناول: کرداری ناول وہ ہوتے ہیں جن میں کہانی کا محور ایک شخص ہوتا ہے۔ وہ کردار اس کہانی کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔

۲) ڈرامائی ناول: ڈرامائی ناول میں واقعات تیزی سے بدلتے ہیں اور ان کی رو تیز ہوتی ہے۔ ایسے ناولوں میں تغیرات اتنی تیزی سے سامنے آتے ہیں کہ قاری ان میں ڈراما محسوس کرتا ہے۔ بعض اوقات ایسے نتائج سامنے آتے ہیں جو توقعات کے برعکس ہوتے ہیں۔ ایڈون میور معاشرتی ناول کو ڈرامائی ناول کہتا ہے۔

۳) مہماتی ناول: ان ناولوں میں ہر آن مہمات سامنے آتی ہیں۔ مہماتی ناول کے کردار اپنی مرضی سے عمل اور ردعمل کے زریعے ناول کے دائرے کو وسیع کرتے ہیں۔

۴) تاریخی ناول: تاریخی ناولوں میں کسی دور کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اکثر اوقات تاریخی کردار بھی سامنے آتے ہیں۔ تاریخی ناول فنی اعتبار سے لکھنا آسان کام نہیں۔ ناول نگار کے لیے یہ اہتمام ضروری ہوتا ہے کہ تاریخی کرداروں کی عظمت، وقار اور معیار مجروح نہ ہو۔ اردو میں عبدالحلیم شرر نے تاریخی ناول لکھنے کا آغاز کیا۔

۵) اصلاحی ناول: معاشرتی اصلاح کے مقاصد کے پیش نظر رکھ کر لکھے جانے والے ناول اصلاحی ناول کہلاتے ہیں۔

۶) عصری ناول: ان ناولوں میں محدود زمانے یعنی چار پانچ یا دس سال کے حالات کسی ایک شخص یا خاندان کی وساطت سے پیش کیے گئے ہوں۔ ایسے ناولوں میں بجائے کسی فرد کے حالات کے محدود عصر کے پورے پورے طبقات کی نفسیاتی حالت بیان کی جاتی ہے۔ بہت سے ناقدین عصری ناولوں کو پسند نہیں کرتے۔ ایڈون میور لکھتا ہے کہ

> ''وہ ہمیں ایسی انسانی حقیقتیں نہیں دکھاتا جو ہمیشہ کے لیے صحیح ہوں،
> وہ ایک بدلتے ہوئے زمانے کی سوسائٹی کی تصویر اور ایسی سیرتوں
> کے مرقع پیش کرنے پر قانع رہتا ہے۔ جو اس معاشرے کے نمونے

ہیں ناول کو کسی عصر میں محدود کرنے سے اس کے معیار کو گرا دیا جاتا ہے'' (۴)

۷)واقعاتی ناول: اس قسم کے ناولوں میں واقعات کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے۔واقعاتی ناولوں میں کرداروں پر زور دینے کے بجائے قصہ گوئی پر زور دیا جاتا ہے۔

اردو میں ناول نگاری کی روایت: قیام پاکستان سے قبل

اردو ادب کے دور اول میں جو مقبولیت نظم کو اصل ہوئی وہ نثر کو حاصل نہ ہوسکی۔یہ جمود اس وقت ٹوٹا جب فورٹ ولیم کالج کا آغاز ہوا۔کالج کے آغاز کے ساتھ ہی سادہ اور آسان نثر لکھنے کی ابتداء ہوئی۔اس کے بعد خطوط غالب نے اردو نثر کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔جبکہ اردو نثر کی حقیقی ترقی ۱۸۵۷ء کے بعد تحریک سرسید کی بدولت وقوع پزیر ہوئی۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی برصغیر پاک و ہند پر برطانوی تسلط کے خلاف ایک بھرپور سعی تھی۔لیکن ناقص منصوبہ بندی اور لامرکزیت کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ نتیجے کے طور پر تمام ہندوستان پر تاج برطانیہ کی حکمرانی مستحکم ہوگئی۔اور اس کا اثر تمام شعبہ زندگی کی طرح ادب پر بھی پڑا۔مغربی افکار و نظریات نے ادباء کو براہ راست متاثر کرنا شروع کیا۔اور ساتھ ہی قدیم روایت سے بغاوت بھی شروع ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ سرسید عہد میں بہت سی نئی اصناف نے ادب کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لیا۔جو اصناف سرسید کے زیر اثر پروان چڑھیں ان میں ناول بھی شامل ہے۔

محققین کی رائے میں اردو کے پہلے ناول نگار مولوی نذیر احمد دہلوی ہیں۔نذیر احمد کے قصے ناول اور داستان کی درمیانی کڑی ہیں۔ان کے ناول مرأۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ہو یا ابن الوقت اور فسانہ مبتلاء سب ایسے ناول ہیں جن میں مختلف سماجی اور معاشرتی رویوں کے ساتھ ساتھ سیاسی اور نفسی آہنگ بھی اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں:

''نذیر احمد کے جن قصوں کو متفقہ طور پر ناول کا نام دیا گیا ہے۔

ان میں فن کے وہ لوازم موجود نہیں جن کا مطالبہ جدید دور کے

ناول سے کیا جاتا ہے۔'' (۵)

اسی عہد میں ایک اور نام جو ناول کے حوالے سے ہمارے سامنے آتا ہے۔وہ عبدالحلیم شرر کا ہے۔ان کے ناولوں کو بھی بہت پزیرائی ملی۔فردوس بریں اور ملک العزیز ورجینا ان کے ناولوں میں دو نمایاں نام ہیں۔ڈاکٹر وقار عظیم اپنی کتاب ''داستان سے افسانے تک'' میں دونوں ناول نگاروں کے فن کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

'' نذیر احمد، سرشار ہماری ناول نگاری کی تاریخ میں فنی روایت
کے پیش رو ہیں۔ان دونوں ابتدائی ناول نگاروں نے اپنے
دور کی دور بینی سے قصہ گوئی کی دنیا میں ایک نئی ڈگر کا کھوج
لگایا۔اپنے فنی عمل کے زریعے اس میں ایسی شمعیں جلائیں
جنھوں نے ہر آنے والے کی راہ روشن کی'' (۶)

ان کے علاوہ کچھ اور نام بھی اس عہد میں ناول نگاری کے حوالے سے سامنے آئے۔جن میں منشی سجا حسین، مرزا ہادی رسوا، علامہ راشدالخیری قابل ذکر ہیں۔ان لوگوں نے اردو ناول کے ابتدائی دور میں اپنی کاوشوں اور فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عمدہ اور قابل ذکر ناول لکھے۔مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا لکھ کر اردو ناول کو فن کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ

'' جہاں تک ناول کے فن اور تکنیک کا تعلق ہے امراؤ جان ادا
ایک مکمل ناول ہے اس کا پلاٹ واضح، مرتب اور مربوط ہے۔
کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی ایسا نہیں جو زائد یا فضول معلوم
ہو۔پھر پلاٹ کا ارتقاء اور تکمیل بھی موجود ہے۔کردار نگاری بھی
مکمل ہے اور زبان و بیان سے بھی یہ ایک بے عیب تصنیف ہے'' (۷)

اسی دور میں علامہ راشدالخیری نے ناول لکھے۔عورتوں کو درپیش مسائل ان کی تعلیم و تربیت وغیرہ کا احاطہ کرنے کی سعی کی۔ان کے ناولوں میں صبح زندگی، شام زندگی، نوحہ زندگی، عروس کربلا، حیات صالحہ، شب زندگی، ماہ عجم اہم ہیں۔بیسویں صدی میں پریم چند منظر عام پر آئے انہوں نے دیہی زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔دیہاتی زندگی کی

مشکلات، کسان، مزدور اور معاشرے کے نچلے طبقے کی زندگی کی عکاسی پریم چند کا خاص وصف ہے۔ان کے ناولوں میں بازارِ حسن، گئودان، میدانِ عمل، گوشۂ عافیت، چوگانِ ہستی، اسی طرز کے آئینہ دار ہیں۔عزیز احمد، پریم چند کی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"پریم چند کا ناول منزلِ ارتقاء میں اپنے سے پہلے کے ناول نگار کے ناول سے

کم سے کم ایک صدی آگے ہیں" (۹)

بیسویں صدی اپنے ساتھ بڑے ہنگامے لے کر آئی۔ ہندوستان کے ڈرے سہمے لوگوں میں بیداری اور بغاوت کی لہر سر اٹھا رہی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام اسی نئے سیاسی شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم اور ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس ایسے ے واقعات ہیں جن سے پوری دنیا متاثر ہوئی۔ کارل مارکس کے نظریات، اور لینن میں روس کا انقلاب برپا کرنا پوری دنیا میں جبر اور استحصال کی قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار تحریکوں کے لیے ایک روشنی کی کرن ثابت ہوا۔ مارکس افکار و نظریات ایک با قاعدہ تحریک کی شکل میں ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں آئے۔ یہ ترقی پسند تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔اس تحریک نے اردو ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔تحریک کا مقصد معاشرے کے پسماندہ طبقے کا ساتھ دیا جائے دولت کی مساویانہ تقسیم معاشی آزادیوں کے لیے جدوجہد کی جائے۔ چنانچہ تحریک سے وابستہ ادیبوں نے بڑے زور و شور سے ان افکار و نظریات کو اپنی تخلیقات میں سمویا۔

اردو ناول کا پاکستانی دور:

۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے برطانوی سامراج کا خاتمہ ہوگیا۔ بھارت اور پاکستان کے نام سے دو الگ مملکتیں وجود میں آئیں۔قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں لکھے جانے والے ناولوں کا سب سے بڑا موضوع تقسیم ہند اور فسادات ہے۔ برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کا آغاز ہوا تو مسئلہ یہ تھا کہ برطانیہ اقتدار منتقل کرے۔ ہندو اسے اپنا حق سمجھتے اور مسلمان اپنا۔اسی نقطۂ نظر نے اختلاف کا بیج بویا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنی بقاء کے لیے

''اداس نسلیں'' اور احسن فاورقی کا ''شام اودھ'' اہم ہیں۔ یہ تمام وہ ناول ہیں جنہیں ثقہ ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں اردو ادب میں انقلاب آفرین تبدیلیوں کا زمانہ ہے۔ ترقی پسند تحریک پر پابندی اور مارشل لاء دو ایسے بڑے عوامل ہیں۔ جنہوں نے ادب میں ان تبدیلیوں کی راہ ہموار کی۔ صنعتی ترقی اور شہری معاشرے کا قیام پہلے سے موجود اخلاقیات اور رویوں کو متاثر کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید مغربی افکار و نظریات کا اثر بھی اس عہد میں اردو ادب پر پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ساٹھ کی دہائی کے بعد لکھے جانے والے ناول جدید رویوں اور جدید لوازمات ادب کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے۔ ان لکھنے والوں میں انتظار حسین، انور سجاد، اور انیس ناگی کے نام نمایاں ہیں۔ انتظار حسین کے ناولوں میں بستی، تذکرہ، آگے سمندر ہے، انیس ناگی کے ناولوں میں ''دیوار کے پیچھے، میں اور وہ، شامل ہیں۔ علامتی اور تجریدی افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت پانے والے انور سجاد ناول نگاری میں بھی اسی موڑ کے ساتھ داخل ہوئے۔ ان کا ناول ''خوشیوں کا باغ'' مغربی افکار کا آئینہ دار ہے۔ دوسرا ناول ''جنم روپ'' ہے۔ انیس ناگی اور انور سجاد کی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فاروق عثمان لکھتے ہیں

> ''انیس ناگی اور انور سجاد موجودہ صورت حال کے جدید ناول نگار ہیں
> ان کے ہاں اپنے عہد کا ضمیمہ بہتر انداز میں جھلکتا ہے۔ ان کے ناولوں
> کی جماعت اپنے فنی اعتبار سے اس قبیل کے دوسرے لکھنے والوں
> سے مختلف ہے'' (۱۲)

ناول کا ارتقائی سفر کا جائزہ لینے کے بعد ہم کو دو ہی مقام ایسے دکھائی دیتے ہیں جب ناول کثرت سے لکھا گیا۔ ایک نذیر احمد سے پریم چند تک، جب نذیر احمد، سرشار، رسوا، اور راشد الخیری، پریم چند نے ایک تسلسل سے ناول لکھے۔ دوسرا زمانہ قیام پاکستان کے فوراً بعد کا ہے۔ جب قراۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، شوکت صدیقی، اے حمید، الطاف فاطمہ، نسیم حجازی نے کئی ایک عمدہ ناول لکھے۔ سن ۸۰ء کی دہائی کے بعد بھی ناول نگاری کی طرف رجحان دکھائی دیتا ہے۔ اس تسلسل کو سامنے رکھتے ہوئے شہزاد منظر نے لکھا ہے۔

''پاکستان میں ناول کا مستقبل بہت روشن نہیں تو مایوس کن بھی نہیں
سن ۸۰ء کے عشرے میں اردو ناول کا جو احیاء ہوا سے جاری رہنا
چاہیے اور ادیبوں خصوصاً افسانہ نگار اور ناول نگاری کی طرف توجہ
دینی چاہیے'' (۱۳)

پاکستان بننے کے بعد بے شمار ایسے ناول بھی لکھے گئے جو اپنے زمانے میں بھی مقبول ہوئے۔لیکن انہیں ادب میں شمار نہیں کیا گیا۔کیونکہ ادب کسی فن پارے سے جن جمالیاتی اقدار کا تقاضا کرتا ہے۔وہ ان میں موجود نہیں تھے۔ان میں تاریخی ناول بھی شامل ہیں۔اور عام عشقیہ ناول بھی اور خواتین کے مسائل پر لکھے گے ناول بھی۔اس دور میں اگر چہ بہت سے ناول لکھے گئے لیکن اپنے جذباتی پن کی وجہ سے ان کو ادب میں شامل نہیں کیا گیا۔جاسوسی ناولوں کا ایک طویل سلسلہ سامنے آتا ہے۔ان میں سب سے اہم نام ابن صفی کا ہے۔موجودہ دور میں چند نام ناول کے حوالے سے بہت اہم ہیں جن میں مستنصر حسین تارڑ،اظہر بیگ،فردوس انور قاضی،آغا گل وغیرہ کے نام بہت اہم ہیں۔آغا گل کا تعلق بلوچستان سے ہے۔اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل موضوع پر جانے سے قبل صوبہ بلوچستان اس کی اہمیت وافادیت کے حوالے سے چیدہ چیدہ معلومات کا ذکر کیا جائے۔

اپنے موضوع پر خامہ رسائی سے پہلے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ موضوع کی مناسبت سے ایک مختصر جائزہ بلوچستان کے تعارف اور وہاں کی ادبی روایت کا جائزہ لیا جائے تا کہ ہم آغا گل کی تحریروں کو وہاں کے ماحول ومنظر میں رکھ کر دیکھ سکیں اور اس کا با آحسن جائزہ لے سکیں۔

بلوچستان ایک مختصر تعارف:

بلوچستان رقبے کے اعتبار سے ملک کا سب سے بڑا،آبادی کے لحاظ سے سب سے چھوٹا،معدنیات اور وسائل کے اعتبار سے امیر ترین اور جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے اہم ترین صوبہ ہے۔بلوچستان دراصل دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔''بلوچ'' اور ''ستان'' کا۔بلوچ تو قوم کا نام ہے۔اور ''ستان'' قدیم آریائی زبان کا لفظ ہے۔جس کا مطلب

ہے رہنا۔ بلوچستان کے محل وقوع کی وجہ سے پاکستان کو مشرق وسطی کے خطے سے وابستہ ایک ملک خیال کیا جاتا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے اس علاقے کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، بالائی کوہستانی خطہ، نشیبی کوہستانی خطہ، میدان اور صحرا۔ بلوچستان میں ایسا کوئی دریا نہیں ہے۔ جس میں پانی بڑی مقدار میں یا مستقل طور پر پایا جاتا ہو۔ بلوچستان ایک کوہستانی علاقہ ہے۔ بلوچستان کے پہاڑوں تلے گنج ہائے گراں مایا چھپا ہوا ہے۔ جسے انگریزوں نے چھپانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ چھپ سکا۔ ان معدنی ذخائر میں اینٹی مونی، کرومائیٹ، سیسہ، مینگا ئز، نکل، زنک، خام لوہا، تانبہ، اسبیسوس، فلورائیٹ، یاقوت، گریفائیٹ، کھڑیا مٹی، چونے کا پتھر، میگنائیٹ، سنگِ مر مر، تیزابی نمک، سوپ سٹون، گندھک، کوئلہ، قدرتی گیس وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

بلوچستان کی بڑی آبادی زیادہ تر ان قبائل پر مشتمل ہے جو بلوچی زبان بولتے ہیں۔ اور بلوچ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی آبادی بلوچستان کے تقریباً دو تہائی حصہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ نسلی اور لسانی گروہ کے حوالے سے دوسرے نمبر پر براہوئی قبائل اور زبان آتی ہے۔ تقریباً نصف ملین (پانچ لاکھ) افراد یہ زبان بولتے ہیں۔ بلوچی اور براہوئی کے بعد تیسرے نمبر پر پشتون آتے ہیں۔ پشتو زبان بولنے والوں کی زبردست اکثریت ہے۔ لیکن اسے جغرافیائی اور اقتصادی عوامل کا کرشمہ سمجھنا چاہیے کہ تمام افغان قبائل معاشرے کے تقریباً ان ہی اصولوں کی پیروی کرتے ہیں۔ جن پر بلوچ قوم کی عمارت استوار ہے۔ مندرجہ بالا لسانی گروہوں کی زبان اور نسل میں چاہے فرق موجود ہو لیکن اس کے باوجود صدیوں کے میل ملاپ، تاریخی عمل اور جغرافیائی عوامل نے ان کو کچھ اس طرح سے ملا دیا ہے کہ ان میں یکسانیت پیدا ہوگئی اور ایک یہ قومیت کے اجزاء تصور کیے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ ان کے کلچر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ بلوچستان کی بکھری ہوئی اور منتشر گروہی معاشرت کے باوجود دو لاکھ سات ہزار مربع میل میں سے زائد اس علاقے پر محیط ایک متحد اور ایک رنگِ ثقافت اور تہذیب کا غلبہ موجود رہا جو کہ مشرق میں دریائے سندھ سے مغرب میں ایران کے صوبے کرمان تک پھیلا ہوا ہے۔ از موضوع آغا گل کے فکشن میں بلوچستان کی تہذیب و ثقافت ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ مختصر طور پر تہذیب و ثقافت کے معنی و مفہوم کا تعین کر دیا جائے۔

تہذیب وثقافت:

تہذیب، تمدن، تربیت، ذہنی ترقی ظہورِ انسانیت، اختیار آداب رکھ رکھاؤ۔ یہ ایک مجموعی لفظ ہے، جو معاشرت تہذیب اور تمدن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے تہذیب، ثقافت، تمدن کے معنوں میں فرق ہے۔ ثقافت کے اصطلاحی معنی ''انسانوں کے طریق زندگی'' کے ہیں۔ ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی کسی طبقہ وقوم کی تہذیب وترقی کے ہیں۔ اس کے معنی دانائی اور عقلمندی کے ہیں۔ بعض ماہر سماجیات اس کے معنی نکھارنے اور سنوارنے سے اخذ کرتے ہیں۔ کچھ ماہرین ثقافت کو کسی قوم ومعاشرے کے احساسات وفنی لیاقت کی عکاسی قرار دیتے ہیں۔ گویا مجموعی طور پر ثقافت کو طرزِ معاشرت کا نام دیا گیا ہے۔ انگریزی میں ان کے لیے کلچر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی ''ہل چلانا'' یا ''کھیتی باڑی'' کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں اس کے معنی ومفہوم میں ذہنی ترقی، اخلاق و آداب، طرزِ معاشرت، تہذیب وتمدن اور قومی خصوصیات شامل ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام کام اکتسابی ہوتے ہیں۔ یعنی فرد قدرتی طور پر سیکھ کر آیا ہوتا ہے۔ ان میں جبلی اور فطری طور پر انجام پانے والے کام شامل نہیں۔ مثلاً بھوک جبلی شے ہے اس لیے ثقافت میں شامل نہیں مگر اس کو مٹانے کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں وہ ثقافت میں شامل ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں ثقافت ماحول اور ضرورت کے تحت جنم لیتی ہے۔ اور پروان چڑھتی ہے۔ ثقافت ہر شخص کی ضرورت ہے۔ اور ہر شخص ثقافت میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

تہذیب ثقافت کی ایک شاخ ہے کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ جدید دور کے محققین نے تہذیب میں ہر طرح کے تکنیکی علوم کو شامل کیا ہے۔ ثقافت کی طرح ہر شخص تہذیب میں اپنا کردار ادا نہیں کرتا ہے۔ اور یہ اس کے لیے ضروری بھی نہیں۔ ثقافت کی ترقی میں تہذیب ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ثقافت تہذیب یافتہ بھی ہو سکتی ہے اور غیر تہذیب یافتہ بھی۔ مثلاً حجری دور کی ثقافت ۳۰۰۰ ق م میں تہذیب یافتہ ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس دور میں تحریر اور شہر وجود میں آچکے تھے۔ تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر واحساس کا جوہر

پہچان ہیں اوراس کے اہم اجزاء ہیں۔

☆ مشترکہ زبان ایک متحدہ معاشرہ کی تشکیل وعلامات کا ایک اہم جزو ہے۔بلوچی زبان ایک قدیم زبان ہے۔یہ زبان ایران کی قدیم زبان پہلوی اوراوستازبان کی ہم عصر ہے۔بلوچی زبان صدیوں سے فارسی،سندھی،پشتو،اور پنجابی زبانوں کے ساتھ نزدیک ہونے کے باعث الفاظ کا تبادلہ کرتی رہی ہے۔

☆ بلوچوں کا مخصوص لباس ان کی ظاہری شناخت ہے۔جو اسے دیگر اقوام کے افراد سے منفرد وممیّز کرتا ہے۔خانہ بدوش ہونے کے سبب بلوچوں میں لباس کی نمودونمائش کے مقابلے میں ستر پوشی کی حیثیت حاصل ہے۔انہوں نے لباس کو جنگی ضرورتوں کے مطابق بنایا۔بلوچوں میں صدیوں سے رائج دس گز کی پگڑی ڈیڑھ تھان کا شلوار، پانچ گز ڈھیلا کرتہ ہوتا ہے۔بلوچ خواتین کا لباس منفرد وخوبصورت ہے۔بلوچی کڑھائی ونقش ونگار کو اہم حیثیت حاصل ہے۔

☆ اس میں کوئی شک نہیں کہ مہمان نوازی ہر قوم کی اقدار میں شامل ہے۔لیکن بلوچ سماج میں مہمان کی خاطر جان کی بازی لگانے کے کثیر تعدادواقعات ہیں۔بلوچ سماج میں مہمان خود بھوکا رہ سکتا ہے۔لیکن مہمان کی خدمت کی خاطر ہر وہ کوشش کی جاتی ہے جواس کی استطاعت وقوت میں ہے۔

☆ عورت کو جتنی عزت واحترام بلوچ سماج میں ہے شاید ہی کسی اور سماج میں یا معاشرے میں ہو۔اگر دو فریقوں،دو قبائل کے درمیان لڑائی یا جنگ وجدل ہواوراگر کوئی خاتون میدان جنگ میں لڑائی ختم کروانے کی غرض سے آجائے تو وہ عورت کے عزت واحترام کی خاطر ختم کر دیتے ہیں۔چند خاندانوں کے علاوہ بلوچ قبائل میں پردے کا رواج نہیں۔وہ مکمل آزاد ہیں۔زندگی کے مختلف شعبوں میں مردوں کے شانہ بشانہ مصروف نظر آتی ہے۔

☆باھوٹ میار چلی،یعنی کسی شخص پر کوئی ذاتی دشمنی یا قبائلی جنگ کے سبب کسی کے ہاں پناہ لینا ہوتا ہے۔بلوچ تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔کیونکہ کمزور شخص اپنی حفاظت دفاع نہ کرنے سبب کسی دوسرے فرد یا قبیلے کے ہاں میار بن جاتا ہے۔وہ فرد یا قبائل کسی شرط یا معاوضے کے بغیر اس کی جان ومال کی حفاظت کے لیے ہر قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔بلکہ وہ اسے اپنا قومی فرض سمجھے گا۔

☆ بلوچ قوم تاریخی طور پر ایک خانہ بدوش قوم ہے۔وہ پہاڑوں،دریاؤں،صحراوں،اور دشت وبیاباں میں زندگی

گزارتے رہے ہیں۔صحرا نشینی کے سبب بلوچوں کے رویے میں جستجو تلاش وتحقیق کے جذبات پیدا کیے ہیں۔جو ابھی تک قائم ودائم ہیں۔جسمانی طور پر مضبوط اور بہت بہادر ہیں۔

☆ بلوچ ثقافت میں مدد وتعاون کے عناصر بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔یہ مدد وتعاون خصوصاً شادی وغم کی حالت میں کیا جاتا ہے۔بجار بلوچ سماج میں شادی کے موقع پر دیا جاتا ہے۔بجار اور پھوڑی کے ساتھ ساتھ بلوچ سماج میں مدد و تعاون کی ایک تیسری رسم عام ہے۔بلوچی میں اسے حشر کاری کہا جاتا ہے۔مکران کے علاقوں میں اس کو اوچکی کہا جاتا ہے۔

☆ بلوچ قوم قدیم دور سے کسی شخص کی ہمت جرات وشخصیت کو پرکھنے کا واحد زریعہ قول واقرار کے زریعے کیا جاتا ہے۔بلوچ قوم نے قول واقرار پورا کرنے میں شاندار روایات قائم کی ہیں۔بلوچ سماج میں قول واقرار پورا نہ کرنے والے کو بے عزت تصور کیا جاتا ہے۔

☆ بلوچ سماج میں چور کو ثابت کرنے کے طریقے نہایت عجیب ہیں۔یہ طریقہ زیادہ تر عینی شاہد نہ ملنے کی صورت میں کیا جاتا ہے۔بعض قبائل میں اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے دو طریقے رائج ہیں یعنی ملزم یا تو انگاروں پر چلے یا پھر پانی میں مقررہ وقت تک غوطہ لگائے۔

☆ بلوچ سماج میں بکری بھیڑ کے شانے کی لکیروں سے بیماری امن جنگ،موسمی حالات اور دیگر قدرتی آفات کے بارے میں پیشن گوئیاں کی جاتی ہیں۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ زیادہ تر ایسی پیش گوئیاں درست ثابت ہوئی ہیں۔

☆ پڑس بھی امداد وباہمی تعاون ہے۔لیکن اسے صرف موت کے موقع پر امداد کی شکل میں مرنے والے کے ورثاء کو ان کے طلب نہ کرنے پر رضا کارانہ طور پر دیا جاتا ہے۔

☆ بلوچ سماج میں بچے کی پیدائش کے چھٹے دن اس کا نام رکھا جاتا ہے۔اس دن کو رسم شنشگان کہتے ہیں۔

☆ بلوچ معاشرے میں ایک رسم ولور کی بھی ہوتی ہے۔ولور کو بطور حق مہر بیٹی،یا بہن کو واپس کر دیا جاتا ہے۔جس سے سسرال بھی خوشی میں شامل رہتا ہے کہ ولور کا دیا ہوا پیسہ واپس بخیر وخوبی گھر میں آ گیا۔

ہمارا موضوع چوں کہ " آغا گل کے فکشن میں بلوچستان کی تہذیب وثقافت کی عکاسی" اس حوالے سے مطالعہ ہے۔اس لیے یہاں اس بات کا سرسری مطالعہ ضروری ہے کہ بلوچستانی ادب کی صورت حال اوراس کی تہذیب وثقافت کے کیا رنگ ہیں۔جو آغا گل کی تحریروں میں صاف نظر آتے ہیں۔

بلوچستان میں اردوادب کی روایت:

اردواور بلوچی زبان وادب کے مابین تعلق کی متعدد جہتیں ہیں۔دونوں زبانوں کی نشو ونما ارتقاء کی داستان نہایت دلچسپ ہیں۔دونوں سیر وگردش کی رسیا رہی ہیں براہوی اور بلوچی زبانوں میں ادب کی روایت کمزور رہی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ خانہ بدوش زندگی اور کمزور مادی ومعاشی وسائل نے اس ادبی روایت کو پروان چڑھنے نہیں دیا۔بلوچی ادب کی تاریخ ابھی یک مدون نہیں ہوئی ہے۔قدیم ادبی سرمائے کی دریافت اوراسے مرتب کر کے چھاپنے کی کوششیں جاری ہیں۔تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قدیم ادبی سرمائے کی قدامت کہاں تک پہنچے۔اب تک کی دریافت وتحقیق،عہد چاکر (پندرھویں صدی عیسویں) سے تعلق رکھتی ہے۔گوکہ بلوچوں کی افتادہ طبع،شعری میلانات اورثقافتی مزاج کے پیش ونظر بلا خوف وتردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ بلوچی ادب کی تخلیق کا سنہری دورتو وہی رہا ہوگا۔جب بلوچوں کے قبائل بحرخزرج (۵۵۰۔ق م) کے کنارے آباد تھے۔اوروہیں بتدریج بعض طائفے جنوبی ومشرقی ایران،کرمان،سیستان،اورایرانی بلوچستان رہتے بستے پندرھویں صدی عیسویں میں موجودہ بلوچستان میں آکرآباد ہوئے اور پاکستان کے دوسرے علاقوں میں پھیل گئے۔ہرچند کہ بلوچی اوراردوادب،نشو ونما کی مختلف سطحوں پر ہیں۔بلوچی کی کل مطبوعہ کتابوں کی تعداداب ۱۹۷۶ء تک پانچ سو سے متجاوز نہیں ہوئی۔جبکہ صرف ۷۳۔۱۹۷۲ء میں ۴۸۶ کتابیں شائع ہوئیں۔پھر موضوعات کے لحاظ سے اردو میں جس قدر متنوع موضوعات پر کام ہو چکا ہے۔اس کا پاسنگ بھی بلوچی میں اب تک نہیں ہوا۔

اردو فکشن کی روایت،تاریخ کم وبیش ایک صدی پر محیط ہے۔اوراردو فکشن کا مطالعہ کرنا برصغیر کی پوری ایک صدی کی معاشرتی،معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کا مطالعہ بن جاتا ہے۔لیکن زیرنظر مقالے میں راقمہ نے یہاں صرف بلوچستان میں

اردو فکشن کی روایت کو ہی موضوع بحث بنایا ہے۔ فکشن کی تعریف کے حوالے سے غنی پرویز (تربت) رسالہ ''دف'' کوئٹہ میں لکھتے ہیں کہ:

''اصناف ادب میں کلی طور پر صرف ناول اور افسانے کو ہی فکشن کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے'' (۱۴)

بلوچستان میں اردو فکشن کا بیک گراونڈ زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجوہات میں ایک وجہ یہاں کے تہذیبی رویے اور بیک وقت مختلف زبانوں کا رائج ہونا ہے۔ یہاں بلوچی، پشتو اور براہوی زبانوں کے علاوہ فارسی اور اردو بولی جاتی ہیں۔ اس لیے یہاں ابتداء میں صرف اردو افسانوں کی طرف اتنی زیادہ توجہ نہیں ملتی اور اگر لکھے بھی گئے تو فنی اور تکنیکی لحاظ سے کمزور افسانے تھے۔ لیکن بعد میں تہذیبی ترقی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے سبب اس فن کی طرف خصوصی توجہ ہوئی۔

سب سے پہلے جو نام اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ یوسف عزیز مگسی کا ہے۔ یوسف عزیز مگسی کا افسانہ ''تکمیل انسانیت'' ہے۔ یہ افسانہ چار اقساط یکم مئی، ۸ مئی، ۱۴ مئی، ۱۹۳۴ء میں لکھا گیا۔ اور ''بلوچستان جدید کراچی'' میں شائع ہوا۔ کچھ افسانے ہفت روزہ ''پاسبان'' اخبار کے زریعے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک کے ملے ہیں۔ ان افسانوں میں زیادہ تر افسانہ نگاروں کے نام درج نہیں ہیں۔ یہ افسانے بلوچستان میں افسانہ نگاری کے اولین نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں پروفیسر انور، سید خلیل احمد، بیگم خورشید مرزا، عبدالرحمان غور شامل ہیں۔ بقول مبارک حمید:

''بحیثیت مجموعی یہ تمام افسانہ نگار رومانوی رجحان کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں'' (۱۵)

ان افسانہ نگاروں کے علاوہ طاہر محمد خان اور خادم مرزا کے نام افسانہ نگاری میں بہت اہم ہیں۔ ان کے افسانے زندگی کی حقیقتوں کے غماز ہیں۔ تاہم ۷۰ء کی دہائی میں جو افسانہ نگار بلوچستان میں اردو افسانہ نگاری کے حوالے سے سامنے آئے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر فردوس انور قاضی، جو جامعہ بلوچستان میں شعبہ اردو سے منسلک ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں

''آخری ٹرین'' اور ''خیالیے'' بہت مقبول ہیں۔ آغا گل (پورا نام آغا انور گل) حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ بلوچستان کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ آغا گل کے افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جن میں ''گورپچ''، آکاش ساگر''، ''راسکوہ''، ''تارمہ''، ''گوانگو''، ''ڈاک پہ ڈاکہ''، شامل ہیں۔ تیسرا بڑا نام ''عرفان احمد بیگ'' ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''گتے کے پہلوان'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ یعقوب شاہ غرشین کے دو افسانوں مجموعے 'آخری آنسو' اور 'بازگیر' شائع ہو چکے ہیں۔ ثاقبہ رحیم الدین خان ادیبہ ہیں۔ وہ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ انشائیہ نگار بھی ہیں۔ بچوں کے ادب میں جن کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'محبت'' ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں شکیل عدنان، وحید، زبیر، عارف ضیاء الفاروق سرور، ظفر معراج، حسن جاوید، رقیہ آرزو، حمیرا اصدف حسن بھی نئے افسانہ لکھنے والوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ مختصراً بلوچستان میں لکھنے گئے کم وبیش اردو افسانے یا تو اصلاحی ہیں۔ یا پھر نفسیاتی، سماجی، معاشی اور معاشرتی نشیب وفراز کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں ایسے افسانے بھی ہیں جو بلوچستان کے ماحول ومنظر کے علاوہ ملی وقومی تقاضوں کے عکاس بھی ہیں۔ بلوچستان میں ناول کا آغاز بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ہوا تھا۔ ۱۹۶۸ء کے بعد بلوچستان میں ناول کے حوالے سے اولین نام شاہین روحی بخاری کا نظر آتا ہے۔ شاہین روحی بخاری نے سکول کی تعلیم کے دوران پہلا ناول ''ادھورے گیت'' لکھا۔ جو ترکش پبلیشرز کوئٹہ کے زیرِ اہتمام ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ دیگر ناولوں میں ''اونچی حویلی'' ۱۹۷۳ء میں خونِ آرزو'' ۱۹۷۴ء میں'' آنسو کی زبان'' مکتبہ ادب لاہور سے ۱۹۷۵ء میں بالترتیب شائع ہوئے۔ ''خونِ آرزو'' کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ:

''آرزو نہایت ہی خوبصورت اور شاعرانہ ہے'' (۱۶)

احمد ندیم قاسمی کی رائے میں شاہین روحی فیشن ایبل کی زد میں نہیں آئیں۔ بلکہ آغاز ہی سے جو کچھ لکھا اپنی ذات کے حوالے سے اور اپنے مشاہدات، تجربات اور محسوسات کے حوالے سے لکھا۔ شاہین روحی بخاری کی تحریر سلیس ہے۔ ۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر فردوس انور قاضی کا ناول ''خوابوں کی بستی'' شائع ہوا اس میں انہوں نے نئے تجربہ کیے۔ ناول ۵۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ شبل پبلیشرز پرائیوٹ لمیٹڈ کراچی کی جانب سے شائع کیا گیا۔ اس ناول میں پاکستان کی سیاست کو موضوع

بنایا گیا۔ آغا گل کا پہلا ناولٹ ''دشتِ وفا'' ۱۹۸۶ء میں روبی پبلیشرز کوئٹہ نے شائع کیا۔ بقول انعام الحق کوثر:

''آغا گل کی افسانہ نگاری ہو یا ناول نگاری دونوں کا پس منظر
بلوچستان ہی ہے'' (۱۷)

''دشتِ وفا'' ایک رومانی کہانی ہے۔ ان کا ناول ''بیلہ'' مکتبہ الحمراء لاہور کے زیرِ اہتمام ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ بلوچستان کا دارالحکومت کوئٹہ زبانوں کے لحاظ سے گلدستہ ہے۔ اس وجہ سے یہاں پر بولی جانے والی اردو میں ان تمام زبانوں کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ جو نہ صرف اردو میں وسعت کا باعث ہیں بلکہ کوئٹہ کے باشندوں کے لیے اعزاز ہے۔ کوئٹہ کا اپنا دبستان ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کوئٹہ میں بولی جانے والی اردو میں لکھا گیا ہے۔ جو دوسرے علاقوں میں بولی جانے والی اردو سے مختلف ہے۔ امداد نظامی کا ''بھیڑوں کا شہزادہ'' وجدان پبلی کیشنز کوئٹہ کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ شاہد بخاری کا ناول ''چاہت کے پھول'' قلات پبلیشرز کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے۔ خالد اقبال جوئیہ کا ناول ''پڑاؤ'' ۱۹۹۱ء میں بخاری ٹریڈرز کوئٹہ سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن نے ۱۹۶۶ء میں اپنے پہلے ناول ''پرواز'' کو تصنیف کا آغاز کیا۔ ۲۷۸ صفحات پر مشتمل یخونِ ہ ناول ۱۹۶۸ء میں مکمل ہوا۔ دوسرا ناول ''آنسو'' ۱۹۶۹ء میں مکمل ہوا۔ یہ ۳۶۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کا تیسرا ناول ۱۰۸۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اب ہم آغا گل کے ناولوں میں بلوچستان کی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے فرداً فرداً جائزہ لیں گے۔

دشتِ وفا:

ادب کا تعلق جس خطہ زمین سے بھی ہو، اس کی برگ و بار پر وہاں کی آب و ہوا، تاریخ و ثقافت رسم و رواج کے اثرات لازماً مرتب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس زبان و ادب کا مطالعہ کیا جائے تو اس پر اس مخصوص علاقے کی تہذیب و ثقافت کے نشان بہت واضح نظر آتے ہیں۔ یہ اثرات مختلف صورتوں میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم عربی زبان و ادب پر نظر دوڑائیں تو ہمیں اس پر عربی تہذیب و ثقافت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اسی طرح روسی اور انگریزی ادب پر ان کے تہذیبی و ثقافتی خدوخال، ان کی معاشرت کے نقوش، مذہبی اقدار کے واضح اثرات سے ان کا ادب مزین ہے۔

جہاں تک اردو زبان و ادب کا تعلق ہے تو اس پر برصغیر کے مختلف علاقوں کی زبانوں اور بولیوں کے لسانی اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ اردو نے برصغیر کی کئی زبانوں کے الفاظ کو یوں اپنایا ہے کہ وہ اردو کی ملکیت بن گئے ہیں اور ان نسلی و لسانی اثرات قبول کرنے کی وجہ سے اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ برصغیر کی تہذیب و ثقافت و معاشرت کے اثرات اردو ادب پر بالکل واضح ہیں چاہے وہ اردو شاعری میں ہندی کے الفاظ کے رچاؤ کی صورت میں ہوں یا پھر اردو فکشن میں برصغیر کی ثقافت اور سماجی حوالوں کی شمولیت کے روپ میں ہوں۔ بلوچستان پاکستان کا ایک اہم ترین اور منفرد صوبہ ہے۔ کل رقبہ ۴۳ فیصد ہے۔ جو مختلف معدنیات کا ایک بڑا ذخیرہ رکھنے کی شہرت کا حامل ہے اور پھر اس کا محل وقوع اور Geo Political اہمیت بہت زیادہ ہے۔ بلوچستان میں ۶۰ فیصد پشتون ہیں۔ بلوچ، براہوی، سرائیکی، سندھی آبادکار ہیں۔ کل آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ نفوس ہے۔ اور ان کی اپنی الگ الگ ثقافت اور تاریخ ہے۔ بلوچستان کی تہذیب و ثقافت پاکستان کے دیگر صوبوں اور علاقوں کی ثقافت کے مشابہ ہونے کے ساتھ ساتھ کئی پہلوؤں میں مختلف بلکہ متضاد بھی ہے۔ ان میں نیرنگی بھی ہے۔ یہاں کا قبائلی اور معاشرتی نظام بھی اپنی منفرد خصوصیات کی بناء پر اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ بلوچستان کے جغرافیائی خطوں قدرتی یا خودرو پھولوں، پرندوں، آب وہوا اور قدرتی مناظر میں انفرادیت متنوع انداز میں پائی جاتی ہے۔ غالباً اس کا پرتو یہاں کے فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے

والے فنکاروں میں پایا جاتا ہے۔ بلوچستان میں تخلیق ہونے والا ادب بھی یہاں کی تہذیب وثقافت کے مختلف عناصر سے مالا مال ہے۔اور غالباً یوں تو سبھی قابل ذکر ادیبوں کی تخلیقات میں کم کم یہ اثرات پائے جاتے ہیں۔مگر جن دو معروف ادیبوں کے ہاں ان کا استعمال تخلیقی سطح پر متواتر و مسلسل ہوا ہے۔ان میں عطاشاد اور آغا گل کے نام نمایاں ہیں۔ عطا شاد ۱۹۳۹ء کو کیچ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''سنگانی سر'' میں پیدا ہوئے۔ابتداء سے شعر وشاعری کی طرف مائل تھے۔حکومت بلوچستان میں کئی عہدوں پر فائز رہے۔اردو میں ان کے دو شعری مجموعے''سنگاب''اور''برفاگ'' شائع ہو چکے ہیں۔ان کی شاعری میں بلوچی زبان کے نامانوس الفاظ پہلی بار ظہور پذیر ہوئے بلکہ بلوچی ثقافت کے مختلف مظاہر بھی ان کی شاعری کی پہچان ہیں۔ان سب عناصر نے مل کر انہیں ایک الگ اور منفرد شعری پیکر اور لہجہ بخشا ہے جو کہ صرف انہی سے منسوب ہے۔۱۹۹۷ء میں وفات پائی۔آغا گل بنیادی طور پر مختصر کہانیوں کے خالق ہیں۔ان کے ناول معرکہ آرائیوں (Epics) پر مشتمل ہے۔ان کے تمام ہیرو باغیانہ خیالات کے حامل ہیں۔ان کی تحریر میں روسی ناول نگار نکولائی گوگول کے اثرات نمایاں ہیں۔

آغا گل نے بلوچستان کی تاریخ معاشرتی اور معاشی اقدار کو ماہرانہ انداز میں اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش کیا ہے۔انہوں نے اپنی تحریر میں مختلف ثقافتوں اقدار اور رسم ورواکو اجاگر ہے۔اس حوالے سے متعلق آغا گل نے''ماہنامہ روشناس کراچی آغا گل نمبر''میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ

> '' بڑے بڑے تخلیق کار تہذیبی،ثقافتی اور معاشرتی قدروں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔نظیر اکبر آبادی کی شاعری دیکھیے،حتیٰ کہ قدیم یونانی شاعر ہومر کے ہاں اس کا التزام ملتا ہے۔کالی داس کو دیکھیے میر امن نے باغ وبہار میں ایسا ہی انداز اختیار کیا ہے۔۔۔۔۔اپنے دور کی اقدار کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔۔۔۔۔میں بھی تاریخ،ثقافت،سیاست ،معاشیات،وغیرہ کہانی میں ساتھ لے کر چلتا ہوں کیونکہ بلوچستان پر

حکمرانی تو کی گئی، فوج کشی تو ہوئی مگر اسے سمجھا نہیں گیا۔۔'' (۱۴)

آغا گل کا شمار بلوچستان کے مایہ ناز افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔بقول حسن ضیاء

''جن کی تحریروں میں بلوچستان اپنی رعنائیوں کے ساتھ جھلکتا

ہے۔۔۔۔۔'' (۱۵)

''دشت وفا'' آغا گل کا اکیسویں صدی میں بلوچستان کا پہلا ناول ہے۔کسی بھی ناول کا اہم عنصر اس کا موضوع ہوتا ہے۔مصنف سب سے پہلے اپنے ذہن میں ایک خیال بناتا ہے۔پھر اس خیال کو کہانی کی صورت دیتا ہے۔نوید حیدر ہاشمی جو ناول کے نام ''دشت وفا'' کے متعلق ''ماہنامہ روشناس آغا گل نمبر'' میں دشت وفا'' کا اداس گل' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''دشت'' کتنا اداس ہے یہ لفظ۔۔۔۔ کتنی ویرانی جھلکتی ہے ان

تین حرفوں سے۔۔۔۔۔کس قدر جھلسا دینے والا تصور ہے اس

دشت کا۔۔۔۔۔کیسا تڑپا دینے والا ہوتا ہے دشت کا سکوت۔

۔۔۔۔۔'دشت' خواب کا ہو یا خیال کا، امید کا ہو یا یقین کا، ہجر

کا یا طلسم ذات کا یا قریہ ادراک کا، سزا کا یا جزا کا، صبر کا یا جفا کا،

دشت، دشت ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔'' (۱۶)

آغا گل کا ''دشت وفا'' اور دیگر کئی ناول دراصل بلوچستان کی عکاسی کا دوسرا نام ہیں۔آغا گل نے اپنے ناولوں میں بلوچستان کے تاریخی وسماجی واقعات، مقامی رنگ کو کہانی میں پہلو بہ پہلو منضبط طریقے سے پیش کیا ہے۔''دشت وفا'' ایک ایسا ناول ہے کہ کوئی بھی اجنبی پورے بلوچستان کے قبائلی نظام، رسوم معاشرتی و معاشی زندگی کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔''دشت وفا'' کے حوالے سے آغا گل اپنے ایک غیر مطبوعہ سوانحی مضمون میں لکھتے ہیں کہ

''دشت وفا'' بنیادی طور پر ایک Epic Novel ہے۔اور اس

میں اینٹی ہیرو پیش کیا گیا ہے۔حسن و محبت کی فضاء میں ۱۹۷۰ء کی

دہائی کے بلوچستان کی عکاسی کی گئی ہے۔ جب بلوچستان کی آئینی
حکومت کو توڑ کر لیڈروں کو گرفتار کیا گیا۔۔۔۔۔نوجوان بندوقیں
اٹھا کر پہاڑوں کے ویرانوں میں جا نکلے کالج، یونیورسٹیوں کو خیر باد
کہہ دیا۔۔۔'' (۱۷)

ناول کی فضاء گویا بلوچستان کی عکاس ہے۔ بلوچستان پہ بہت کم لکھا گیا ہے۔ کسی بھی علاقے کی تاریخ عموماً ادب میں ملتی ہے۔''دشت وفا'' بنیادی طور پر مزاحمتی ادب کے زمرے میں آتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں سیاسی حالات میں بہت کشیدگی پائی جاتی ہے۔ تصادم کی فضا تھی۔ اس حوالے کے متعلق آغا گل ''دشت وفا'' میں لکھتے ہیں کہ

''سیاسی حکومت ملک نہ سنبھال سکی۔۔۔۔۔مارے جانے
لگے عوام، سرکاری اہلکار، بے گناہ معصوم شہری، وزیر اعظم
نے وعدہ کیا تھا سب کے لیے روٹی، کپڑا، مکان مگر صرف
بلوچستان سے وعدہ پورا کیا۔۔۔
جیل کی مفت روٹی، پہننے کو جیل کی وردی اور مکان کے طور پر
قبر کی جگہ مفت۔۔۔'' (۱۸)

آغا گل کا ناول ''دشت وفا'' ایک اہم ناول ہے۔ یہ ناول بلوچستان کی حالیہ دہشت گردی اور علیحدگی پسندی کے رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ اس تمام تر سیاسی صورتحال کی خرابی سے زیادہ نقصان نوجوان طبقے کو ہوا۔ نوجوان طبقہ کسی بھی معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن بلوچستان میں صورتحال یکسر مختلف تھی۔ نوجوان کتابیں ہاتھ میں اٹھانے کے بجائے بندوقیں اٹھائے پہاڑوں میں آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے بھیج دیئے گئے۔ اور پھر آزادی کے لیے جو راستہ منتخب کرتے ہیں انہیں کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے نوجوان مارے گئے، ان کے مستقبل تاریک ہوئے، کچھ گرفتار کر لیے گئے۔ آغا گل ''دشت وفا'' میں اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد دشت وجبل میں محصور چھاپہ مار

کاروائیوں میں مصروف تھی۔مختلف گروہ غیر منظم طور پر کام کر
رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔بہت سے نوجوان عقوبت خانوں میں
تشدد کا نشانہ بنائے جا رہے تھے۔خوش قسمت نوجوان جیلوں
میں بند مشقت کر رہے تھے۔انہیں نہ تشدد کا نشانہ بننے کا اور نہ
جان کا خطرہ تھا۔۔۔۔۔۔۔'' (۱۹)

۷۰ء کی دہائی میں سیاسی نظام میں بھونچال آیا ہوا تھا۔سرداورں،نوابوں،نے اپنے ذاتی مفادات کی خطر عوام کو استعمال کیا۔ان کے اکسانے پہ یہ غیر منظم اور بے مقصد جدو جہد ہو رہی تھی۔آغا گل اس حوالے سے ''دشت وفا'' میں لکھتے ہیں کہ

''بلوچستان جل رہا ہے
جہاں کسی کی دستار سلامت نہیں
جہاں گولیاں چل رہی ہیں نوجوان جان دے رہے ہیں
جہاں ان پہ تشدد کیا جا رہا ہے۔۔۔۔۔'' (۲۰)

والدین اپنے بچوں کو اسکولوں،کالجوں میں تعلیم دلوانے کے خواہشمند تھے۔وہ اپنے بچوں کو خوشحال زندگی بسر کرتا دیکھنا چاہتے تھے۔ان کے پیش نظر یہ امر تھا کہ تعلیم سے ان کے بچوں کی زندگیاں بدل جائیں گی۔لیکن سرداورں،نوابوں نے ان کے معصوم میں دلوں میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی۔ایسے میں ''دشت وفا'' کا ہیرو نجیب زیادہ عرصہ تک اس صورتحال سے لاتعلق نہیں رہ سکا۔اس کے ساتھی پہاڑوں میں آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔مشکلات میں تھے۔ایسے میں وہ محض تماشائی نہیں بننا چاہتا تھا۔اس کے اندر بھی بغاوت کے جذبات میں شدت آگئی۔آغا گل اس حوالے سے ''دشت وفا'' میں لکھتے ہیں کہ

''پکڑ دھکڑ،قتل وغارت،بم دھماکے،انسانی عضا کے ٹکڑے
تھرڈ ڈگری تشدد،اب وہ محض تماشائی نہ تھا۔نہ چاہتے
ہوئے بھی اسے جنگ میں شامل ہونا پڑا۔اسے ایک یقینی طور

شکست سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ جسمانی طور پر، سماجی طور
پر، نفسیاتی طور پر، معاشی طور پر۔۔۔'' (۲۱)

آغا گل کا ناول ''دشت وفا'' میں سیاسی و سماجی حالات کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ وہ لوگ جو مزاحمت کا ورں میں شامل تھے۔ ان کے بچے بھوک افلاس، کا شکار ہوئے۔ معاشی طور پر خستہ حالی کا شکار ہوئے۔ معاشی بدحالی، محرومیوں کی وجہ سے ان کی ذہنی، جسمانی نشو ونما، متاثر ہوئی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ظلم کے خلاف آواز نہیں بلند کر سکتا تھا۔ آغا گل اس حوالے سے ناول ''دشت وفا'' میں یوں رقمطراز ہیں کہ

''جس طرح بلوچستان میں ہیں۔ کاش موت بھی چیک پوسٹ
ہوا کرتی۔۔۔۔۔۔۔ دیکھ بھال کر صرف بکری نما۔۔۔۔۔
غیر مشکوک پرامن انسانوں کو ہی جانے کی اجازت ملتی۔۔'' (۲۲)

اس ناول میں بلوچستان کی سیاست کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جس سے ان کے اچھے اور برے دونوں پہلو سامنے آتے ہیں۔ جبکہ یہ بحث بھی ملتی ہے کہ کیا اس طرح آزادی کی جنگ لڑنی چاہیے کہ نہیں۔ اس سے آزادی ملتی ہے یا ثمر آور ثابت نہیں ہوتی۔ اور ایسی چھاپہ مار کارروائیوں کا مستقبل میں کب تک تسلسل جاری رکھا جا سکتا ہے۔ ہ بہت اہم مباحث ہیں اور بلوچستان کے حوالے سے ان کو مسائل کا اجاگر کر کے آغا گل نے ایک طرح سے اجتہادی کام کیا ہے۔ کیونکہ ایسے مسائل ذاتی اور نجی گفتگو میں تو بکثرت ہوتے ہیں۔ مگر انہیں تحریر و تقریر میں لانا آج کے حالات کے تناظر میں کوئی آسان کام نہیں۔ اور لکھنے اور کہنے والے اس طرح سے خود کو کوئی خطرہ مول لینے نہیں دیتے۔ لیکن آغا گل نے جرات کا مظاہرہ کر کے اس قسم کے سنگین اور حساس معاملات کو چھیڑ کر پہل اور ہمت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سے عام قاری ایک نئی روشنی حاصل کر سکتا ہے۔ اور چاہے تو خود کو بدل سکتا ہے۔ اور امن اور جمہوری طریقوں سے اپنے حقوق کی جدوجہد کا راستہ اختیار کرنے پر آمادہ اور قائل ہو سکتا ہے۔ اور دیکھا جائے تو آغا گل کا جذبہ تعمیری ہے اور مثبت نتائج دے سکتا ہے۔ سرداری اور نوابی نظام صرف جہالت میں ہی پرورش پا سکتا ہے۔ وہاں حکمران بلوچستان کی عوام، خاص طور پر نوجوانوں کو قومیت کا

درس دے کر انتقامی جذبات پیدا کر کے اپنے مفادات کے حصول کے لیے انہیں استعمال کر رہے تھے۔ کیونکہ جہاں تعلیمی نظام ناقص ہوگا یا نہ ہونے کے برابر ہوگا وہیں ایسے حالات پیدا ہوں گے۔ بلوچستان میں ایسے حالات پیدا کرنے کا پہلا کام ۱۹۷۲ء میں ہوا، جب تعلیمی اداروں سے وابستہ اساتذہ کو بلوچستان سے دربدر کیا گیا۔ کسی بھی ملک کی کامیابی و کامرانی کا انحصار تعلیم پر ہوتا ہے۔ تبھی وہ ملک ترقی کرتے ہیں ۔لیکن بلوچستان کے سیاسی حالات حکمرانوں کی وجہ سے ہوئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے بقول آغا گل:

''ساری مخلوق کی اپنی اپنی خوراک ہے۔ ہر کوئی کسی دوسرے کی
موت پر زندہ ہے۔۔۔۔'' (۲۳)

جب عوام کو تعلیم کی نعمت سے بہرہ ور نہیں کیا جاتا۔ وہاں کے لوگ اپنے حقوق سے بے خبر رہتے ہیں۔ معاشی و معاشرتی مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔ غربت اور غلامی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ جہالت اور غربت کی وجہ سے طاقتور کی حکومت چلتی ہے۔ غریب کی مجبوری سے کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لیکن بلوچستان میں لوگ غریب ہونے کے باوجود اپنی قدروں کو نہیں بھولتے۔ آغا گل ''دشت وفا'' میں اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''جہالت اور غربت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں غربت
ہوگی۔ وہاں جہالت ضرور ہوگی، جہاں مچھر ہوگا، وہیں ملیریا
ہوگا، شاید اسی لیے غریب چائے کے ساتھ صرف خلوص ہی پیش
کر سکتا ہے۔۔۔۔۔'' (۲۴)

ایک اور جگہ ناول میں لکھتے ہیں کہ

''جن کا ماضی نہیں ہوتا، جن کا مستقبل نہیں ہوتا۔۔۔۔'' (۲۵)

آغا گل نے ''دشت وفا'' میں تہذیب و ثقافت کے حوالے سے غریب طبقے کی نفسیات کی عکاسی بھی کی ہے۔ کہ جب ناول کی ہیروئن رخسانہ ہیرو نجیب کو اپنے غریب گھر سے متعارف کرواتی ہے۔ تو وہ سکتے میں چلا جاتا ہے کہ اتنی خوبصورت لڑکی

ایسے غربت زدہ ماحول میں رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ رخسانہ کے گھر آنے جانے لگا۔لیکن وہ اپنے گاڑی میں ان کے گھر نہ جاتا۔ آغا گل اس حوالے سے ''دشت وفا'' میں یوں لکھتے ہیں کہ

''غریب آبادیوں کی لڑکیاں شاملات دہیہ کی طرح سارے محلے کی
ملکیت ہوا کرتی ہیں۔ان کی خاطر ہر کوئی لڑنے بھڑنے کے لیے
تیار رہتا ہے۔غریب بھی امیروں سے اسی قدر نفرت کرتے ہیں جتنی
امیر غریبوں سے۔۔۔۔۔'' (۲۶)

آغا گل کا ناول بلوچستان کے تہذیبی ارتقاء کے حوالے سے بھی بہترین عکاسی کرنے والا فن پارہ ہے۔ ''دشت وفا'' میں آغا گل لکھتے ہیں کہ:

'' پہلا ہسپتال پہلے سکھر اور پھر کوئٹہ میں اینگلیکن چرچ کے سکارڈ
مشنر لے نے کھولا۔ بلوچستان کی پہلی ایکس رے مشین پروٹسٹنٹ
مشنر یز لائے۔بلوچستان میں تقدیر کا تصور سکاٹ لینڈ کے ڈاکٹر
ہنری ہالینڈ نے بدلا۔۔۔۔اس نے بتایا کہ اندھاپن، لنگڑاپن،
بیماریوں یا بخار کا تقدیر سے کوئی علاقہ نہیں۔۔۔۔۔'' (۲۷)

اسی طرح ناول میں بلوچستان کی تہذیب کی عکاسی کرتے ہوئے آغا گل ایک اور جگہ بلوچستان کے لوگوں کی معاشرت، ان کے جذبات کا زکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''نہ لسانی تعصبات تھے، نہ مذہبی منافرتیں، انسان ہی انسان
تھے۔نفرتیں یہاں نہیں تھیں۔ بلاشبہ یہاں نفرتیں بوئی جا
رہی تھیں۔لیکن بلوچستان خوشکابہ ہے، یہاں کوئی بیج بھی نہیں
پنپ سکتا، نفرت کا ہی سہی۔۔۔۔'' (۲۸)

کسی بھی ثقافت کی ترقی میں تہذیب اہم کردار ادا کرتی ہے۔تہذیب ہی ثقافت کو پروان چڑھاتی ہے۔ ہر معاشرے

میں مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔مذہب کو بنیادی اکائی سمجھا جاتا ہے۔ہر معاشرے کی اپنی مخصوص اقدار روایات ہوتی ہیں۔بلوچستان میں بھی مذہبی اقدار اور روایات کا خیال رکھا جاتا ہے۔آغا گل ''دشت وفا'' میں اقدار کے احترام کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

'' جمعہ کی نماز ہوتی تو عبادت خشوع وخضوع سے کرنے کے لیے
سفید ٹوپیاں پہن کر مسجدوں میں چلے آتے۔ٹریفک رک جاتی۔
جمعہ کے روز نائی کی دوکانوں میں قوالیاں گونجتی تھیں۔اذان کا
وقت ہوتا تو ہوٹلوں کی ریکارڈنگ بند کر دی جاتی۔محرم میں بعض
ہوٹل دس روز بند رہتے۔۔۔۔۔۔'' (۲۹)

بلوچستان میں لوگ اپنی روایات کا بہت سختی سے خیال رکھتے ہیں۔آغا گل نے ''دشت وفا'' میں رخسانہ کا جو کردار پیش کیا ہے۔وہ پشاور سے تعلق رکھتی ہے۔ہندکو زبان بولتی ہے۔رخسانہ کا کردار بلوچستان کی روایات،اقدار،ثقافت کے برعکس نظر آتا ہے۔آغا گل نے صرف اسی ناول میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ناولوں میں ہیروئنوں کے جو کردار پیش کیے ہیں ان کا تعلق بلوچستان سے نہیں ہے۔رخسانہ کا کردار بہت ہی بولڈ اس ناول میں دکھایا گیا ہے۔مثلاً آغا گل ایک مقام پر رخسانہ کے کردار کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''لڑکوں کا لباس پہن کر موٹر سائیکلوں پہ ساتھ ساتھ گھومتی
اس کے ساتھ بے حساب پیتی،سگریٹ کے کش لگاتی
نغمے گاتی،گیت الاپتی
تیز میوزک پہ ڈانس کرتی
رخسانہ ایک ڈریم گرل،گلیمر گرل۔۔۔۔۔'' (۳۰)

جب کہ بلوچستان میں عورتوں کا پردے میں رہنا ایک لازمہ ہے۔عورت کو جتنا عزت واحترام بلوچ سماج میں حاصل ہے،شائد ہی کسی اور سماج میں حاصل ہو۔بلوچستان میں اگر دو فریقوں،دو قبائل کے درمیان لڑائی،جنگ وجدل ہو اور اگر

کوئی خاتون میدان جنگ میں آکر لڑائی ختم کروانے میں مداخلت کرے تو وہ خاتون کے عزت و احترام کی خاطر ختم کر دیتے ہیں۔ایک مقام پر رخسانہ اور نجیب غازی کو گاڑی میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جا رہے ہوتے ہیں کہ راستے میں ایک چیک پوسٹ پر گاڑی روک لی جاتی ہے۔پوچھ گچھ کے بعد ایک سپاہی نے نجیب سے پوچھا۔آغا گل ناول میں اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ

''سپاہی: پچھلی سیٹ پر کون ہیں؟

میری والدہ ہیں نجیب نے جواب دیا

سپاہی نے جھڑکا۔ماں کا ادب کرو

والدہ کو آگے بٹھاؤ'' (۳۱)

لیکن بلوچستان میں غیر سنجیدہ عورتوں، اور بازاری عورتوں کو بہت حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔آغا گل نے ناول میں ان عورتوں سے نفرت کے اظہار کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

''تمہیں اس لڑکی کے ساتھ دیکھ کر افسوس ہوا ہے۔ایسی

عورتوں کو بلایا جاتا ہے۔ان کے اڈوں پر نہیں جایا جاتا

انہیں ساتھ ساتھ لیے پھرنا تو بڑی بدنامی کا باعث ہے

----- '' (۳۲)

آغا گل نے ''دشت وفا'' میں ثقافت اور معاشرت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ہر معاشرے کی طرح بلوچستان میں بھی مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے۔لیکن بلوچستان میں مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے۔وہ اسے غیرت کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔مثال کے طور پر ناول میں ایک مزاحمتی لیڈر غازی کو گولیاں لگتی ہیں۔اور وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔اس کی جان بچانے کے لیے ضروری تھا کہ اسے محفوظ مقام پر پہنچا کر اس کا علاج کروا دیا جائے۔لیکن قدم قدم پر چیک پوسٹیں ہونے کے سبب غازی کے پکڑے جانے کے امکانات زیادہ تھے۔ایسے میں نجیب نے تجویز دی کہ غازی کو چادر اوڑھا دی تا کہ

کوئی پہچان نہ سکے۔ کیونکہ حالات کا تقاضا تھا ایک جنگی چال کے طور پر ایسا کرنا ضروری تھا۔لیکن غازی یہ سن کر طیش میں آجاتا ہے۔اور نجیب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

''عورت بن کر چادر اوڑھ کر نکلوں؟اس سے تو موت بہتر ہے
تم ایک براہوی کی توہین کر رہے ہو
میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر
نجیب نے بہت سمجھایا کہ اس کا عزت سے کیا تعلق؟ کئی علاقوں
میں مرد سردیوں میں چادر اوڑھتے ہیں۔دور سے پتہ نہیں چلتا کہ
مرد آرہا ہے یا کہ عورت۔۔۔۔۔'' (۳۳)

بلوچستان میں غیرت کے نام پر قتل کرنے ایک عام سی بات ہے۔یہ ان کی ثقافت کا حصہ ہے۔آغا گل کا ناول ''دشت وفا'' میں بھی غیرت کے نام پر قتل کا واقعہ ملتا ہے۔ایک مقام پر رخسانہ نجیب کو دھوکا دے کر اپنے کزن غفار کے ساتھ مل کر کسی دوسرے ملک بھاگنے کا منصوبہ بناتی ہے۔اس صورت حال کو آغا گل نے ناول میں یوں بیان کیا ہے کہ

''پستول نجیب کے قریب زمین پر گرا ہوا تھا۔مگر جھک کر اٹھانے
کی مہلت نہ تھی۔موت کو اس قدر قریب دیکھ کر اسے پریشانی نہ
ہوئی۔بس احساس شکست مارے جا رہا تھا۔۔۔۔۔
بے وفا عورت، میں تمہیں اور غفار کو دنیا کے کسی کونے میں سے
بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔۔۔۔۔
نجیب نے شست باندھ فائرنگ شروع کر دی۔۔۔۔۔لانچ کے
پرخچے اڑ گئے اور سب ہلاک ہو گئے،سمندر سب کچھ نگل گیا۔۔
۔۔۔۔۔۔'' (۳۴)

بلوچستان کی تہذیب وثقافت کا ایک اہم عنصر مہمان نوازی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مہمان نوازی ہر قوم کی اقدار میں

شامل ہے۔لیکن بلوچ سماج میں مہمان کی خاطر جان کی بازی لگانے کے بے شمار واقعات ملتے ہیں۔بلوچ سماج میں خود بھوکا رہ سکتے ہیں۔لیکن مہمان کی خدمت کے لیے ہر کوشش کی جاتی ہے جو اس کی استطاعت وقوت میں ہے۔ناول میں رخسانہ اور نجیب پہاڑوں میں مقیم اپنے ساتھیوں سے ملے جو آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔آغا گل اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''ساتھیوں نے بڑی محبت سے انہیں خشک روٹی قہوے کے
ساتھ پیش کی۔البتہ وی آئی پی دعوت کے لیے روٹی میں گڑ
ملا دیا تھا۔۔۔۔۔'' (۳۵)

اس صورت حال کو دیکھ کر رخسانہ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔اس نے اپنا کچھ زیور انہیں تحفتہً پیش کیا۔جس سے وہ اپنا ضروری سامان کھانے پینے کی بنیادی اشیاء پوری کر سکیں۔لیکن انھوں نے ان سب سے انکار کر دیا۔آغا گل کے بقول:

''وہ سب کھلکھلا کے ہنس پڑے اور زیوروں کو ہاتھ تک نہ لگایا
اور بولے،ہم بہنوں کے زیور اتارتے نہیں بلکہ پہناتے ہیں
۔۔۔۔۔۔۔'' (۳۶)

''دشت وفا'' میں منظر نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔آغا گل نے کوئٹہ شہر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔مثلاً ایک جگہ آغا گل یوں لکھتے ہیں کہ

''چہار غاش سے بادل کوئٹہ پر اتر آئے تھے،تیز بارش ہو
رہی تھی،بھیگی بھیگی سڑکوں پہ لوگ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے
گھروں کو جا رہے تھے
فضاء میں خنکی تھی،کوئلے کے دھویں کی مہک تھی
فرخ ہوٹل سے چند گز دور تھانہ روڈ،صرافہ بازار کے محلے میں
رقص وسرود کی محفلیں گرم تھیں۔۔۔۔'' (۳۷)

آغا گل نے اس ناول میں کوئٹہ شہر کی عکاسی زلزلے کے بعد کی بہت دلکش انداز میں کی ہے۔کہ ۱۹۳۵ء کے زلزلے کے بعد تمام مکان ہٹما بنائے گئے۔لوگوں کا خیال تھا کہ ٹین کی چھتوں کا زلزلے کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔اسی حوالے سے آغا گل

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

''بے شمار ٹین کے ڈبوں کا نام کوئٹہ ہے۔شائد شہر کی تباہی
نے ماہرین کے ذہن کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہو۔۔۔'' (۳۸)

آغا گل نے ''دشت وفا'' میں برف زدہ علاقوں کی بھی بہت عمدہ عکاسی کی ہے۔

''سردیوں کی اداس راتوں میں جب بھوکے بھیڑیئے برفباری
کے ہاتھوں فاقہ کشی تک آ پہنچے اور شہر کے مضافات میں پیٹ
بھرنے کے لیے چلے آتے ہیں۔گھنٹوں وہ اسٹوو میں کوئلہ ڈال کر
بجھنے نہ دیتا۔۔۔۔۔۔سٹوو کی گرگراہٹ میں اپنائیت ہوکرتی
جیسے ایک بہت ہی پیاری بہت ہی سندر سندر سی ماں کی لوری
۔۔۔۔۔۔'' (۳۹)

''دشت وفا'' ناول کی فضا بلوچستان کی عکاس ہے۔آغا گل ایک مقام پر بلوچستان کے دریاؤں اور راستوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''پانی کے بغیر دریا صرف بلوچستان میں ہی پائے جاتے ہیں''
''بلوچستان کے مزاج کی طرح بلوچستان کے راستے بھی پر پیچ
ہیں'' (۴۰)

بلوچستان کی تہذیب وثقافت کی عکاسی کرتے ہوئے آغا گل ''ماہنامہ روشناس'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

''بلوچستان میں صرف چشموں کو بولنے کی اجازت ہے،ہواؤں
کو گنگنانے کا حق ہے،ورنہ صدیوں پہ چھائی ایک خاموشی ایک
تاریک چادر مسلط ہے۔واپڈا کے کھمبے ہٹا دیئے جائیں تو کوئی نہیں
جان سکتا کہ کون سی صدی ہے۔حضرت ابراہیم کا دور ہے یا اکیسویں

صدی؟۔۔۔۔۔۔۔۔ (۴۱)

اس اقتباس کا پہلا جملہ ہی ذومعنویت کا عکس اپنے اندر رکھتا ہے۔یعنی بلوچستان میں صرف چشمے ہی گفتگو کرتے ہیں۔باسیوں کو بولنے کی اجازت نہیں ہے۔بلوچستان میں آزادی اظہار،آزادی رائے کا تصور ہی نہیں ہے۔

ناول کو پڑھتے ہوئے یوں گمان ہوتا ہے کہ قاری کوئٹہ کے بازاروں اور گلیوں میں گھوم رہا ہو۔آغا گل نے بلوچستان کی تہذیب وثقافت کی عکاسی بہت عمدہ انداز میں کی ہے۔بلوچستان میں ہوٹلنگ عام ہے۔:بقول آغا گل:

''ہوٹلوں میں گیت ابل ابل آتے،تان سین ہوٹل،مشنگ
ہوٹل،سندھ مسلم ہوٹل،نرگس ہوٹل،ڈو ہوٹل،وکڑی ہوٹل،
حمید شاہ کا نشاط ہوٹل،۔۔۔۔۔۔۔یہ ہوٹل ادارے تھے۔
پناہ گاہیں تھیں۔۔۔۔'' (۴۲)

ایک اور جگہ اسی حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''ایسے ہوٹلوں میں چرس یا شراب پینے پر پابندی تھی۔۔۔۔
کوئٹہ کی چرس کا چاردانگ ڈنکا بجتا۔۔۔۔'' (۴۳)

دوستوں کے ساتھ ہوٹلوں میں بیٹھنا،گپیں ہانکنا،ہوٹلوں کے مالکان کے ساتھ تعلقات استوار کرنا۔بلوچستان کی سیاسی صورتحال کے سبب ان ہوٹلوں میں ہی سکریٹ انفارمیشن کا تبادلہ ہوتا۔بعض اوقات پلاننگ اور منصوبہ بندی بھی یہیں بیٹھ کر کی جاتی۔بقول آغا گل

''نجیب کو خفیہ پیغام ملا''رحمان کہاں ہے۔کئی دنوں سے
نہیں دیکھا۔اسے چائے پلاؤ''
پیغام کا مطلب تھا۔رحمان کو فوری طور پر ڈان ہوٹل میں
ملو۔۔۔۔۔۔۔ '' (۴۴)

غرض یہ کہ آغا گل نے اپنی تحریروں میں بلوچستان کی ثقافت اور رسم و رواج کو اجاگر کیا ہے۔''دشت وفا'' میں ناول اپنے منطقی انجام تک پہنچتا ہے۔جس میں ساتھ ساتھ حالات کا تجزیہ بالکل غیر محسوس طور پر ہے۔آغا گل کا اسلوب سادہ، آسان، اور دلچسپ ہے۔چھوٹے چھوٹے فقروں میں ساری بات سمجھانے کا ہنر رکھتے ہیں۔ان کی تحریروں میں زیادہ تر بیانیہ انداز ملتا ہے۔ان کی تحریر کا اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو سادگی کی جھلک ملتی ہے۔

بابو:

آغا گل خطہ بلوچستان کے معروف اور مشہور ادیب ہیں۔ بلوچی اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں مہارت سے لکھنا اور اظہار خیال کرنا ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ ان دونوں زبانوں میں متعدد مقبول کتابوں کے مصنف ہیں۔ جو ادب یعنی ناولوں اور افسانوں کے علاوہ دیگر موضوعات پر محیط ہیں۔ جن میں تحقیق، تاریخ، مذہب وغیرہ شامل ہیں۔

لفظ ''بابو'' دراصل اس ناولٹ کے مرکزی کردار یعنی ہیرو کا (Nick Name) پیار کا نام ہے۔ یوں تو ساری دنیا میں ہی بچوں کے (Nick Name) رکھنے کا رواج ہے۔ مگر برصغیر کے ممالک میں یہ فرض زیادہ ہی پھیلا ہوا ہے۔ یوں تو ہر بچے کا بڑی شفقت اور چھان بین کے بعد بڑے اہتمام سے عربی، ترکی، فارسی آمیز لاحقوں اور سابقوں سمیت بڑا بھاری بھرکم نام رکھا جاتا ہے۔ مگر اس ساری کاوش پر فوراً ہی ایک بے معنی سی عرفیت کو محیط کر کے پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ اور نومولود کو چوچو، منو، لڈن، مچھو، پپجا، گاما، چھیما، کبن، مجھن، جیسے بے معنی ناموں سے پکارا جانا اپنی محبت کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ بے معنی ناموں کے رکھنے کا یہ رواج ہمارے معاشرے کے صرف نچلے طبقے یا متوسط طبقوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ شوق فراواں ہمارے معاشرے کی ہائی سوسائٹی میں بھی اسی طرح مقبول ہے۔ وہاں بھی عرف جمی، ٹمی، پوپی، چوچو، جانی، مانی، شانی، کی بہار دکھائی دیتی ہے۔

جن لوگوں نے اردو کی مشہور ادیبہ محترمہ قرۃ العین حیدر کے ناول پڑھے ہیں بالخصوص ان کا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' وہ ان نک نیم کی مقبولیت اور بھرمار سے بخوبی آگاہ ہوں گے۔ بہرحال ان عرفی ناموں میں ''بابو'' بھی ایک سدابہار، پسندیدہ اور مقبول نام ہے۔ لیکن اس کی مقبولیت صرف نچلے اور متوسط طبقات تک ہی محدود ہے۔ اشرافیہ اس نام کو گھاس نہیں ڈالتی کیونکہ یہ ان کے سٹیٹس Status کے خلاف ہے۔ (Nick Name) عموماً لڑکپن تک ہی ساتھ دیتے ہیں۔ بچے کے ذی شعور ہوتے ہی ان ناموں کی بے معنویت اور مضحکہ خیز صورتیں اس بچے پر اس بری طرح

آشکار ہونے لگتی ہیں کہ وہ اپنی پوری شعوری کاوش سے ان ناموں سے پیچھا چھڑانے لگتا ہے۔مگر اس کے برخلاف کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو اپنی عرفیت سے عشق ہوا کرتا ہے۔وہ اسے پیر تسمہ پا بنا کر ساری عمر بڑی خوشی سے اپنے کندھوں پر سوار رکھتے ہیں۔وہ اپنے نک نیم کو حرز جاں بنا لیتے ہیں۔ساری عمر اس بے نام سے پکارے جانے کو اپنی مقبولیت کی معراج سمجھتے ہیں۔اس ناولٹ کا مرکزی کردار اور ہیرو ''بابو'' بھی انہی میں سے ایک ہے۔اس ناول ''بابو'' کے حوالے سے شفیق احمد شفیق لکھتے ہیں کہ

''ان کے ناول بھی اپنے موضوعات کے لحاظ سے ان کی کہانیوں کی طرح اردو کے دیگر ناولوں سے مختلف ہیں۔موضوعات کی رنگا رنگی نے ان کے اسلوب کو نہ صرف تازگی و شادابی بخشی ہے بلکہ ایسی شیرینی بھی تخلیق کی ہے جس میں تلخی کا شائبہ تک نہیں ہے'' (۴۵)

آغا گل نے اپنے بیشتر افسانوں اور ناولوں کے موضوعات کو بلوچستان سے جوڑ دینے کی کوشش کی ہے۔یعنی بلوچستان کے معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کی طرف نشاندہی کی ہے،تو کہیں بلوچستان کے معاشرے میں پیدا ہونے والی برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے،تو کہیں بلوچستان کے پہاڑی علاقوں کی قبائلی لڑائیوں کے خلاف چلنے والی تحریکوں کی عکاسی کی ہے۔کہیں بلوچستان کے ماحول اور معاشرے کا رہن سہن، عادات، طور طریقے کی دلکش انداز میں عکاسی کی ہے۔اس کے علاوہ وہاں کی تاریخ، تہذیب و ثقافت اور عوامی زندگی کے کئی پہلوؤں کو بھرپور انداز میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

ماحول بھی ناول کا ایک اہم عنصر ہے۔آغا گل نے ناول ''بابو'' میں بلوچستان کے ماحول کو پیش نظر رکھ کر منظر کشی کی ہے۔واقعات اور کرداروں کے حوالے سے بلوچستان کے معاشرے اور ماحول کو فنی مہارت سے پیش کیا ہے۔یہ سارا ناول خصوصاً بلوچستان کے مکین راجستھانی عوام ان کے رہن سہن، رسم ورواج، عادات اور (معاشرے کی برائیوں اور

تہذیب وثقافت)وغیرہ پرمشتمل ہے۔

سراب اسلم ایک جگہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے بلوچستان کے خاص ماحول کو اپنے ناولوں اور افسانوں کا پس منظر بنایا ہے۔ان کی زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں پیش کی ہیں۔ان کے سماجی مسائل کو فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔شاید اسکی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آغا گل خود اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔اس لیے یہ سارا ماحول ان کا دیکھا اور برتا ہوا ہے۔یہ ناول صرف معلومات اور مطالعے کی حد تک محدود نہیں ہے۔بلکہ اس ماحول کی عکاسی میں ہمیں جو بے تکلفی اور حقیقت نگاری نظر آتی ہے وہ کافی حد تک درست نظر آتی ہے۔اس میں عشق ومحبت کی داستان اور نوجوانوں کی ابتدائی دور کی کوئٹہ میں تفریحات کے ذرائع اور برائیوں کا براہ راست اظہار کیا گیا ہے۔

> ''ان لڑکوں کا کام تھا ہیرو بننے کی ناکام کوشش کرنا نقل سے امتحان پاس کرنا، اساتذہ کو تنگ کرنا، عجب اتفاق وہ سبھی وقت سے پہلے جوان ہوگئے تھے۔۔۔۔۔عشق کا زیادہ تصور یوں ابھرا کہ کوئٹہ کی واحد تفریح سینما بنی تھی ساری فلمیں عشقیہ تھیں''انداز، آب حیات، انتظار، ساقی، کالی گھٹا،'' سارا شہر عشقیہ گانوں سے گونجتا رہتا، سینماؤں میں فلمی کہانیوں کی چند صفحات پر مشتمل کتابیں بھی دستیاب تھیں۔۔۔'' (۴۶)

ایک اور جگہ یوں لکھتے ہیں کہ

> '' لڑکے تھڑے پر حسب معمول دو پہر میں بیٹھے گھنٹوں بتادیتے زور زور سے قہقہے لگاتے، ساتھ میں گالیوں کے سابقے لاحقے لگاتے رہتے، پس دیوار بابو کی والدہ دعائیں دیا کرتیں، تھڑے پر محفل جمائے ان لڑکوں کو یہ البتہ نرالی تکریم تھی۔۔۔یہاں یہ راجستھانی زبان میں روز تمھیں گالیاں دیتی ہے کہ کائیں کائیں کرتے ہو۔تم اسے دعائیں سمجھتے ہو۔۔'' (۴۷)

آغا گل نے ناول ''بابو'' میں جگہ جگہ بلوچستان کے معاشرے، رسم و رواج، عادات و اطوار کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی بلوچستان کی جغرافیائی جھلک بھی پیش کی ہے۔ آغا گل نے بلوچستان کے جغرافیائی ماحول کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

'' دوستوں نے فوراً ہی تھانے سے فرار ہونے میں مصلحت دیکھی
اس شام ایک حوصلہ افزاء خبر ملی کہ پنجگور کے علاقہ میں بابو کو دیکھا گیا
ہے وہ تربت کی بس کی چھت پر بیٹھا تھا۔۔۔ اگلے ہفتے بابو لوٹ آیا
مگر پہچانا نہ جا سکا۔ دھوپ سے رنگ جل چکا تھا۔ گرم صحرائی ہواؤں
نے حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ ان دنوں۔۔۔ سسی پنوں کے قلوہ جا پہنچا۔ روایت
ہے کہ بی بی کے مزار پر مانگی جانے والی عشاق کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔
آنٹی سسی کا پتہ نہیں کس اونٹ پر کیسے وہاں پہنچی ہو گی وہ بھی اس زمانے میں
شاید اونٹ بھی BMW کار کی طرح ہوتے ہوں گے اس زمانے میں
2500CC ٹربو اونٹ، انٹر کولر اونٹ'' (۴۸)

آغا گل کے ناول ''بابو'' میں بلوچستان جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ بلوچستان بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ بلوچستان کے پہاڑوں، دریاؤں، ہوٹلوں کی محفلوں، قابل تعریف مقامات کا عمدگی سے ذکر کرتے ہیں۔ کوئٹہ میں کس طرح نوجوانوں کا ہوٹلوں پر جانا، آوارہ گردیاں کرنا یہ تمام مناظر منفرد انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔ مصنف نے ہوٹلوں کا ذکر جن خوبصورت الفاظ سے ادا کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ مثلاً

''اگر بلدیہ ہوٹل چلیں تو سبھی کو چائے پلوائے گا۔ سموسے کھلوائے
گا بلدیہ ہوٹل کے سموسوں کا نام سن کے سبھی کے منہ میں پانی بھر آیا
ترنت جھگڑا چھوڑ کر دوست بن گئے۔ بابو نے بستہ کسی لڑکے کے
حوالے کیا اور ساتھ چل دیا۔۔۔'' (۴۹)

''بلدیہ ہوٹل دوپہر میں خالی پڑا تھا انہوں نے دو میزیں جوڑ کر درختوں
کے نیچے محفل جمالی۔۔۔۔'' (۵۰)

ایک اور جگہ ہوٹلنگ کا منظر کچھ یوں بیان کیا ہے:

''وہ دوبارہ ہوٹل میں آن بیٹھے، بابو کھلے جا رہا تھا، بابو نے سگریٹ منگوائے
چائے سموسے منگوائے سارے دوست بہت خوش ہوئے کہ اتنا بڑا حاتم طائی
ان کے علاقے میں آ گیا تھا۔۔۔ '' (۵۱)

آغا گل نے روزمرہ زندگی کے مطابق حالات بیان کیے بلوچستان کے گلی کوچوں، محلوں، بازاروں کا منظر آنکھوں میں گھوم جاتا ہے اس میں الگ الگ ذائقے، ماحول اور رویے دکھائی دیتے ہیں۔ شفیق احمد شفیق اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''آغا گل نے بڑا اعتبار قائم کیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے
ذریعے زندگی کی ترجمانی ہی نہیں کی بلکہ زندگی کے خوبصورت سے خوبصورت
اور بدنما سے بدنما وقوعوں اور سانحوں کو فن آرائش بھی عطا کی ہے۔ ان کا ہر افسانہ
ایک الگ ذائقے، ماحول اور انسانی رویے کو پیش کرتا ہے'' (۵۲)

آغا گل نے سماجی حالات کو ایسے بیان کیا ہے کہ ہر کردار کی عمر، جسمانی خصوصیات وغیرہ کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس ماحول میں رہتے ہیں اور کردار کن کن اچھائیوں اور برائیوں کے مالک ہیں۔ مثلاً اس ناول میں بلوچستان کے لوگوں کے رہن سہن، رسم و رواج اور طور طریقے اور زبان کی نشو و نما منعکس ہوتی ہے:

''بابو کی تین بہنیں تھیں اور خود فقط ایک ہی بیٹا تھا ماں باپ اس کا ہر حکم بجا
لاتے لاڈ پیار کرتے تھے۔۔۔۔ ایک دن بابو کی والدہ نے کھڑکی کھولی
کچھ بلائیں لیں اور پانی کی بالٹی سروں پر انڈیل دی بھگدڑ مچ گئی۔ اس قدر
سردی وہ برفاب جانے کہاں سے لائی تھی کہ جسم نیلے پڑ گئے۔ جگت چچا نے

انکشاف کیا۔۔۔۔یہ راجستھانی زبان میں روز تمھیں گالیاں دیا کرتی تھیں
کائیں کائیں کرتے ہو۔۔۔۔کہتی ہے نمونیہ ہو جائے مرو۔۔۔۔۔یہ تھڑا
چھوڑ دو اس چمن میں تمہارا ٹھکانہ نہیں'' (۵۳)

بلوچستان میں لوگ دوستی اور دوست کی خاطر جان بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔آغا گل کے ناول کے ہیرو''بابو'' کے سب ساتھی زمیا، انور، گھوڑا، صدیق، یوسف سب اپنی اپنی وساطت سے بابو کی ہر ممکن مدد کرتے ہیں۔اس کا ساتھ دیتے ہیں

'' بابو تم حیرت مت کرو۔چار مہینے بعد تو لاہور کے کالج بند ہو جائیں گے
شوٹ شوٹ آجانا گھوڑا ریلوے کا پاس لے دے گا۔بابو تم نے ہم لوگوں کو
گیر کیا ہے''
میں بھی تم لوگوں کے لیے سخت فکر مند ہوں۔۔۔'' (۵۴)

ایک اور جگہ یوں لکھتے ہیں کہ

''بابو تم شوٹ جاؤ شوٹ آؤ، یار جلدی جلدی تعلیم کرو۔بس یار کیا کروں،
بابو کرا ابا کی ضد ہے ورنہ تو
East or West Quetta is the best (۵۵)

'' ان دنوں گھر میں نسیم کے نام پر جھڑپ ہو گئی، خالو کے ہاتھ چھڑی لگی اس
نے بابو کی پٹائی۔۔۔۔انور اچانک کود کر بابو کے سامنے آکر کھڑا ہوا، بابو
کے سر پر پڑنے والی چھڑی انور کے ماتھے پر لگی اور خون پھوٹ پڑا۔۔۔
۔۔۔'' (۵۶)

آغا گل نے دوستوں کی دوستی کو بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔دوست آپس میں لڑ بھڑ جائیں بھی تو کسی دوسرے کو خبر نہیں ہونے دیتے۔وضع داری کے مارے محفلوں، ہوٹلوں، میں جانا چھوڑ دیتے ہیں کہ کوئی دوست کا پوچھ لے تو کیا جواب دیں گے۔آغا گل ناول میں اس کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں کہ

''بابو اپنی سادگی میں کسی کی ضمانت دے بیٹھا وہ قرض دار بھاگ نکلا، قرض خواہ نے پولیس کو خبر دی۔۔۔۔یوسف نے دیکھا کہ پولیس والے پکڑنا چاہتے ہیں۔ضمانتاً اس نے اپنے آپ کو پیش کر دیا میں بابو ہوں۔چلو زدے کدھر چلنا ہے۔۔۔۔اتنے میں بابو کو خبر ہوئی تو وہ دوڑا چلا آیا یوسف کہے میں بابو ہوں جبکہ بابو اقرار کرے کہ وہ بابو ہے'' (۵۸)

آغا گل نے اپنے ناول ''بابو'' میں بلوچستان کی تہذیب وثقافت مذہبی اقدار وروایات کے حوالے سے بکثرت ایسے واقعات بیان کیے ہیں۔جو ناول میں دلچسپی کے اضافے کا باعث ہیں۔اور ساتھ ہی بلوچستان میں لوگوں کے مذہبی لگاؤ کو واضح کرتے ہیں۔مثلاً بابو کے والدین نسیم سے شادی کروانے پر رضامند نہیں ہوتے۔بابو نے نسیم کو حاصل کرنے کے لیے درباروں، مزاروں، امام بارگاہوں کے چکر لگائے دعائیں مانگیں۔آغا گل لکھتے ہیں کہ

''اللہ مالک ہے، یہ بابو کا مشہور ومعروف فقرہ تھا۔بات بے بات وہ کہہ دیا کرتا، اللہ مالک ہے۔بابو اب بزرگان دین کے پیچھے لگ گیا کبھی اس مزار کبھی اس مزار۔۔۔۔۔'' (۵۹)

ایک اور جگہ ملاحظہ کریں کہ

''اس نے منت مانی کہ نسیم سے شادی ہو جائے تو نویں محرم میں علم دیا کرے گا۔محرم میں ایک دیگ چاول نیاز دیا کرے گا، مجالس میں شریک نہ ہو سکا تو شامِ غریباں میں ضرور شامل ہوا کرے گا'' (۶۰)

آغا گل نے ناول ''بابو'' میں بلوچستان میں موجود توہم پرستی کے حوالے سے بھی لکھا ہے۔مم Sphinx بالائی دھڑ کی عورت کا آدھا جسم عورت نما اور باقی شیرنی کا جو روایتی طور پر مردوں کو اٹھا کر کوہِ مردار میں لے جایا کرتیں۔انھیں پھل وغیرہ کھلاتی پلاتیں اپنا بنا کر رکھتیں۔مردوں کے پاؤں کے تلوے چاٹ چاٹ کے پاؤں کم زور کردیتیں تا کہ مرد بھاگ نہ جائیں۔

آغا گل نے ناول''بابو'' کے ذریعے بلوچستانی معاشرے کے مسائل کو بھی ہمارے سامنے لائے ہیں۔معاشرے میں استحصال کی کون کون سی صورتیں قائم ہو رہی ہیں۔سیاسی صورتحال کی ابتری کو بھی آغا گل نے ناول کے ذریعے بیان کیا ہے۔مثلاً معاشرے میں حاجت مند لوگوں کے ساتھ ساتھ جرائم کی ایک دنیا بھی موجود ہے۔ مثلاً حکومتی نظام کی خرابی کی وجہ سے سرکاری افسران ملازمین کی تعیناتی سفارش اور رشوت کی بناء پر کررہے تھے۔دوسرے صوبوں کے لوگ جعلی ڈومیسائل بنوا کر رشوت دے دے کر نوکریاں حاصل کررہے تھے۔اس ناہموار صورتحال کو آغا گل بیان کرتے ہیں کہ

''۔۔۔۔۔بے روزگار جوق در جوق بلوچستان کا رخ کر رہے تھے
جعلی ڈومیسائل بنوا کر نوکریاں حاصل کر رہے تھے۔۔۔۔۔جس گاؤں
کا پہلا مجاہد نوکری حاصل کرتا تھا،اس کے بعد پورے پورے گاؤں
کو بلوچستان کی ملازمتوں میں فٹ کر دیا جاتا۔بعض نیک دل ڈپٹی کمشنرز
نے ریٹ مزید کم کر دیا تھا تاکہ منی سیٹوں پر نظر گاڑنے والوں کو تکلیف نہ
ہو۔۔۔'' (۶۱)

آغا گل نے بلوچستان کے معاشرے میں پھیلی سماجی برائیوں کی عکاسی بھی اپنے ناول''بابو'' کے ذریعے کی ہے۔جو رفتہ رفتہ ان کی ثقافت کا حصہ بن گئی ہیں۔اور صدیوں سے چلی آرہی ہیں۔مثلاً ناول میں سود خوری کے حوالے سے آغا گل لکھتے ہیں کہ

''کوئٹہ سود خوروں کے لیے جانب واطراف میں مشہور ہے۔۔
۔۔۔۔'' (۶۲)

آغا گل نے ناول ''بابو'' میں بلوچستان کے معاشرے میں شراب نوشی نشہ آور اشیاء کے استعمال پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

''انور اور بابو دونوں ایک روز چین کارنر میں پی رہے تھے۔۔۔
بابو پی کے بہک رہا تھا۔۔۔میری محبت پاکیزہ ہے اس پانی کی
طرح اس نے وہسکی کی جانب اشارہ کیا، پھر انگلی ڈیم کی جانب موڑ
دی،خوف کے مارے انور کے ہاتھوں میں گلاس لرز گیا،انور بعد حواس
ہوگیا سارا نشہ پل بھر میں ہرن ہوگیا۔۔۔'' (۶۳)

ناول میں بعض مقامات پر نشہ آور اشیاء کے استعمال کو محفلوں اور مجلسوں کے لیے ایک ضروری شے کی حیثیت سے دکھایا ہے مثلاً

'' جوبلی ایریا۔۔۔ایسی محفلیں For only members ہوا کرتی
ہیں۔۔۔ایسی محفلوں کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ممبر شپ کارڈ
کے طور پر ہاتھ میں چرس کا سگریٹ۔۔۔ایسی محفلوں میں دھڑا دھڑ پیتے
ان سگریٹوں کو پیتے ہوئے سگریٹ کا رخ امریکی راکٹ کی طرح آسمان کی
طرف کرنا پڑتا تھا ماش (چرس) کے بھرے سگریٹوں کو انگشت شہادت اور
انگوٹھے کی مدد سے پکڑا جاتا تھا'' (۶۴)

بلوچستان میں معاشی و معاشرتی انقلاب کے بعد بہت سی برائیاں پیدا ہو چکی تھیں جس سے منچلے نوجوان اپنا مستقبل برباد کر رہے تھے۔بلوچستان سے گہری وابستگی ہونے کے سبب آغا گل نے اس معاشرے کی اصلاح کو اپنا موضوع بنانے کی کوششیں تمام ناولوں اور افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں، مثلاً اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

'' لڑکے بات بے بات چاقو نکال لیا کرتے تھے بابو کی خوشی

بھی انتہا کی تھی کہ اسے لڑنے بھڑنے والے دوست مل گئے۔

جو نیفوں میں کلپ اور چاقو چھپائے پھرتے تھے۔۔۔۔ (۶۵)

ناول ''بابو'' بلوچستان کے تہذیب و ثقافت کا بہترین عکاس ہے۔جس سے ہم بلوچستان کے مختلف مناظر کو دیکھ سکتے ہیں۔ناول میں مصنف نے بابو کی ماں کا جو کردار پیش کیا ہے وہ سخت راجستھانی معلوم ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے کردار کہیں کہیں جھول کا شکار ہوتا دکھائی دیتا ہے۔لیکن اس اعتراض کے باوجود یہ بات درست ہے کہ ماں کا رتبہ شدید بلند ہے۔اس لیے اسکا احترام ضروری ہے۔اس ناول ''بابو'' میں مصنف نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے جب کوئی انسان کسی منفی کام میں ملوث ہو جاتا ہے تو وہ کچھ بھی کر گزرتا ہے، مثلاً آغا گل لکھتے ہیں کہ:

ماں زور آور لڑاکا ہے۔میں کیا کر سکتا ہوں بھلا، میں تو اس کے
ہاتھوں تنگ ہوں بڑی خونخوار ہے تمہاری ماں اس کو سمجھاؤ، نذیر
نے احتجاج کیا'' (۶۶)

''ماں نے راجستھانی زبان میں گالیاں اور کوسنیں دیا کرتی تھی، بابو
پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی وہ سوٹ کیس پٹخ کر دوستوں کی تلاش میں
نکل کھڑا ہوا'' (۶۷)

ناول نگار نے اس کہانی کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات کی عکاسی بھی کی ہے۔اور ان کے لیے ضروری نہیں کہ ذکر کرنے کے لیے کسی تمہید کا سہارا لیں، بلکہ وہ روانی میں بات کرتے جاتے ہیں۔بلوچستان میں رہنے والوں کی زندگی کے معاشی وسماجی تہذیبی سیاسی مسائل مختلف نوعیت کے ہیں۔ناول کا ہیرو بابو اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے۔ماں باپ کے لاڈ پیار کی وجہ سے بگڑ چکا ہے۔ماں باپ راجستھان سے تعلق رکھتے ہیں۔اور خالص راجستھانی خیالات کے مالک ہوتے ہیں۔ان دونوں کے خون میں بلوچستان سے عداوت بھری پڑی ہے۔ناول نگار نے ناول کے ذریعے بلوچستان میں علاقائی تعصب کے حوالے سے نشاندہی کی ہے۔بلوچستان کی لڑکی نسیم سے بابو شادی کرنا چاہتا ہے، جبکہ والدین بابو کی شادی راجستھانی

لڑکی سے کرنا چاہتے ہیں۔ بابو کے والد بہت کوشش کرتے ہیں کہ بابو نسیم سے شادی نہ کرے اور اس سلسلے میں بہت حیل و حجت سے کام لیتے ہیں مگر بے سود مثلاً انور اور باقی دوست بابو کے والد سے نسیم کی شادی کے حوالے سے جو گفتگو کرتے ہیں ملاحظہ کریں

"آپ اتنے متعصب کیوں ہیں؟ نسیم میں بھلا کیا حرج ہے
وہ غیر ہے، ہم راجستھانی ہیں خالو گرجا
"آپ راجستھانی ہیں تو یہاں کیا لینے آئے ہیں
ہم آزادی چاہتے تھے ہم نے پاکستان بنا دیا" (۶۸)

ناول نگار نے ناول "بابو" میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ بلوچستان کے لوگوں کی اصلاح ضروری ہے۔ جس کے لیے انھوں نے طنز کا انداز استعمال کیا ہے مثلاً

" ہر قوم اپنے وطن میں آزادی لیتی ہے، انگریز افریقہ بھاگ
جائیں اور وہاں اعلانِ آزادی کریں، فرانسیسی ایران میں جا
کر۔۔۔۔آپ نے تو ہمارا معاشی استحصال کیا ہے، آپ کیا
کوئٹہ میں اپنا گھر دو مربع فٹ کا راجستھان بنانا چاہتے ہیں۔
ہم نے کیا آپ کو دعوت نامہ بھیجا تھا کہ ضرور بہ ضرور تشریف
لائیں، آپ کون سی آزادی اپنے ساتھ لائے ہیں" (۶۹)

آغا گل نے ناول کے ذریعے امن و صلح پسندی اور اونچ نیچ پر روشنی ڈالی ہے۔ اقتصادی و معاشی ناہمواریوں کا ذکر کیا ہے بقول شفیق احمد شفیق:

" ادب نگاری یا تخلیق امنگ سے ان کا دامنِ ہستی مملو ہے وہ ادب کو
محض وقت گزاری کا وسیلہ نہیں سمجھتے، بلکہ اسے تہذیبی، علمی اور سماجی

عمل تصور کرتے ہیں۔۔۔۔۔ن کے ہاں ادب چند گوشوں یا مخصوص
موضوعات کی ترجمانی کا نام نہیں بلکہ ادب کو پوری زندگی کی آئینہ داری
اور سنجیدہ عمل سمجھتے ہیں'' (۷۰)

آغا گل کا ناول ''بابو'' ایک TREND SETTER ناول ہے۔ یہ کوئٹہ کی اردو میں تحریر ہوا۔ یہ اردو محض بولی جاتی ہے کبھی کسی نے اسے تحریری شکل دینے کی ہمت نہیں کی۔ UN WRITTEN DIALECT میں محفوظ کردیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذخیرہ الفاظ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کوئٹہ کی اردو کے حوالے سے آغا گل ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

''غالب صاحب ادراک شاعر تھا اسے یہ علم نہ تھا کہ اہلِ کوئٹہ اس کے
شعروں کو تلفظ سے ذبح کریں گے۔ ورنہ اپنے جگر گوشوں، اپنے شعروں
کو کبھی بلوچستان میں داخل نہ ہونے دیتا، شاہی و ملتھار ندی پر ہی روک
لیتا اپنا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام مدون کر کے اپنا دیوانِ اردو دریائے
بولان میں ڈبو کر چلتا بنتا بہادر شاہ ظفر کے پاس رنگون میں جا پناہ لیتا۔
۔۔۔۔۔'' (۷۱)

آغا گل نے اپنے ناول میں علاقائی زبانوں کے الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں مثلاً کوچرائی، گیو، سوختہ ہونا، لنگ ولاش، صبحِ مردان، آموختہ، داش، ٹکری وغیرہ۔ ان کا خیال ہے کہ یوں اردو زبان میں وسعت آئے گی بقول شازیہ شاہانہ:

''نئے الفاظ، نئے تراکیبیں، نئے خون کی طرح ہوا کرتی ہیں
ورنہ زبانیں ساکت و جامد رہ کر مر جایا کرتی ہیں۔ اردو زبان
میں اتنی طاقت توانائی ہے کہ ہر براعظم کے موسم میں زندہ
رہ سکتی ہے'' (۷۲)

آغا گل نے ایک بہت اہم کام جو کیا ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے اپنی اس مختصری کتاب ''بابو'' کی کہانی میں کوئٹہ کا پس منظر ہی نہیں دکھایا بلکہ مقامی، بلوچی، براہوی، پشتو کے الفاظ ومحاورات روزمرہ تلمیحات اور اصطلاحات کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی، بے تکلفی مہارت سے کیا ہے۔ مثلاً

''شکر خورے کو شکر موذی کو ٹکر بلعت بروزن نیک بدر چہ

گوئیم، ہزارگی محاورہ، تمہاری دال میں انڈا دیوے،۔۔

۔۔۔۔'' (۷۳)

اوران کی تعداد صرف ایک آدھ یا پانچ دس تک محدود نہیں ہے، بلکہ پوری ایک سو ایک ہے۔ بلوچی، پشتو، براہوی کے الفاظ ومحاورات وتراکیب اس بے ساختگی سے استعمال کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کو کہیں بھی اجنبی یا غیر مانوس محسوس نہیں ہوتے۔ بھلے پڑھنے والے کو ان کے معنی ومفہوم معلوم نہ ہو۔ مگر وہ ماحول اور مکالمے کی ساخت طرز بیان سے مطلب اور مفہوم نکال ہی لیتا ہے اور کسی طرح بھی بدمزہ ہو کر کتاب ہاتھ سے پھینک نہیں دیتا۔ آغا گل کو قارئین کی اس شکل کا احساس تھا۔ اسی لیے انہوں نے کتاب کے آخر میں ایک سو ایک الفاظ ومعنی کی فرہنگ بھی لگا دی ہے۔ آغا گل نے اپنے غیر مطبوعہ سوانحی مضمون میں لکھا ہے کہ

''یہ ناول کوئٹہ کی خصوصی اردو میں لکھا گیا ہے جسے ادب کی اصطلاح

میں Regionalism کہا جاتا ہے۔ کوئٹہ کی اردو غیر تحریری

زبان ہے۔ میں نے اسے پہلی بار تحریری شکل دی، امید ہے کہ

یہ سلسلہ چل نکلے گا۔ ہر علاقے، صوبے میں بولی جانے والی اردو

کو اس کے اصل روپ رنگ میں تحریری صورت میں امر کر دیا جائے

گا۔ ایسا ہوا تو میں سمجھوں گا میں اپنی اس حقیری کوشش میں ہمیشہ کے

کامیاب ہو گیا'' (۷۴)

ناول نگار نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے تاریخی واقعات، قبائلی لڑائیوں اور برائیوں کو ختم کرنے کے لیے عشق و حسن کی داستان کے ساتھ پیش کیا ہے تا کہ بلوچستان سے گہری دلچسپی پیدا ہو اس بارے میں آغا گل خود کہتے ہیں کہ میرے ناولوں کو سمجھنے کے لیے کوئٹہ کے گلی کوچوں سے شناسائی بہت ضروری ہے۔

بیلہ:

آغا گل کے ناولوں اور افسانوں کا مرکز و محور بلوچستانی معاشرہ ہے۔ بلوچستان میں جو اردو زبان بولی جاتی ہے ان کی کہانیاں اس کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ اردو ادب کے بیشتر قارئین کے لیے یہ زبان نئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ ادبی لحاظ سے اسے وہ پذیرائی حاصل نہ ہوئی ہو جو ان کے دوسرے ہم عصر فکشن لکھنے والوں کو حاصل ہوئی ہے۔ آغا گل کا اپنا ایک منفرد اسلوب ہے۔ ان کے ناول ''بابو''، بیلہ'' میں پڑھنے والوں کے لیے جملے سخت رسی اور بوجھل معلوم ہوتے ہیں ۔جبکہ ''دشتِ وفا'' منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنے ڈکشن کو زمانے کا لباس پہنانے کی کوشش کی ہے۔ آغا گل کے کردار دو فکشن کے باوا آدم منشی پریم چند نے ادب برائے ادب کا راگ الاپنے والوں کو مسخرہ کہا تھا۔ تیسری دنیا جہاں نصف سے زیادہ آبادی غربت کی ہولناک سطح سے نیچے جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزار رہی اور جہاں جہالت ،اوہام پرستی، ظالمانہ قبائلی رسم و رواج اور خود اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں بدترین معاشی، سیاسی اور سماجی استحصال کے شکار عوام پر ایک آزاد اور باوقار زندگی گزارنے کے تمام دروازے بند ہوں۔ آغا گل اس لحاظ سے لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے عصمت قلم کا سودا نہیں کیا حق پرستی کو شعار بناتے ہوئے اپنے عوام، عہد کی بیباک ترجمانی کا فریضہ انجام دیا۔ بلوچستان میں ناول نگاروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ بلوچستان کے ادیبوں نے ناول نگاری پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ آغا گل نے بلوچستان کے مسائل کو فکشن میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں انھوں نے مختلف تہذیبی ،ثقافتی، معاشی، سیاسی، مسائل پر قلم اٹھایا اور ہمارے معاشرے کی دکھتی رگوں کو چھیڑا ہے۔ آغا گل کے بیشتر افسانوی مجموعوں اور ناولوں کی طرح زیرِ نظر ناول ''بیلہ'' کا عنوان بھی معنویت کی گہری پرت کھولتا ہے۔ ناول کے ایک اہم کردار

ڈاکٹر سرور کی زبانی ناول نگار نے وضاحت کی ہے بقول ڈاکٹر فرخ صابری:

''ڈاکٹر حضرات آنکھوں میں ایک دوائی ڈالتے ہیں۔ بیلہ ڈونا اس
دوائی کی تاثیر سے آنکھ کی پتلی پھیل جاتی ہے، کبھی عورتیں آنکھوں کی
خوبصورتی بڑھانے کے لیے تیز بہدف نسخہ استعمال کیا کرتی تھیں۔
بیلہ کا مطلب خوبصورت جبکہ ڈونا خاتون کو کہتے ہیں۔۔۔'' (۷۵)

اسی طرح ناول میں ایک مقام پر ناول کا ہیرو رحمان، ہیروئن بیلہ سے مخاطب ہوتا ہے، کہ پہلی نظر میں وہ اسے بیلہ ڈونا سے منسوب کر چکا ہے۔ تو محبوبہ جواباً کہتی ہے

''صرف بیلہ کیوں نہیں؟ بیلہ تو موجے کا پھول ہے جو دریا کنارے کا
جنگل ہے'' (۷۶)

مقامی سرائیکی زبان میں لفظ بیلہ کے لغوی معنی اس ہرے بھرے سرسبز و شاداب جنگل کے ہیں۔ جو کسی دریا کے ساتھ ساتھ کناروں پر خودرو انداز میں نمودار ہو کر لہلہانے لگتا ہے۔ بیلہ نام سن کر بقول خالد یوسف:

''یہ نام سن کر سکھر میں دریا سندھ میں ہندوؤں کے قدیم مندر سادھو
بیلہ کی یاد آتی ہے۔ غالباً بیلے کا پھول جو شگفتگی اور تر و تازگی کی علامت
ہے یہی ماخذ رکھتا ہے۔ شاید لس بیلہ، تربیلہ جیسے نام بھی اس لفظ کی
فروعات ہیں'' (۷۷)

ناول ''بیلہ'' کا براہوئی ترجمہ پروفیسر سوسن براہوی نے ''ہیبل'' کے نام سے کیا ہے۔ آغا گل کے ناول ''بیلہ'' کو برطانوی خفیہ ایجنسی ایم ۵ نے حراست میں لے لیا تھا۔ یہ ناول ممتاز ادیب مقصود الٰہی شیخ کو بریڈفورڈ میں ملنا تھا۔ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو برطانوی خفیہ ایجنسی نے یہ ناول پکڑ لیا اور اس کا ریمانڈ لیا تھا۔ دورانِ تحقیق انھیں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ملی۔ ناول کا سرورق لاہور کے ممتاز ادیب منصور احمد نے بنایا تھا۔ جس میں لکھاری کے ہاتھ میں کیلیں پیوست ہیں پاس ہی کچھ میخیں اور

ہتھوڑا پڑا ہوا ہے، ممکن ہے اس ہتھوڑے کا تعلق کریمینل گینگ ہتھوڑا گروپ سے جوڑا گیا ہو، جو گزشتہ ۸۰ء کی دہائی میں سرگرمِ عمل تھا۔ بہت سے لوگوں کے سر کچل کر انھیں ہلاک کر دیا تھا یہ بھی ممکن ہے کہ ہتھوڑے کا تعلق روسی بالشویک انقلاب سے جوڑا گیا ہو۔ کیونکہ درانتی کیمونزم کا نشان تھا۔ برطانیہ میں لکھنے والوں پر کوئی پابندی نہیں آزادی اظہار یہاں تک کہ بعض گستاخ مسیحت کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں۔ مثلاً انگریز ممتاز دانشور برٹینڈ رسل جیسے لکھاری جو اپنے ملحدانہ عقائد کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے ملک میں ایک ناول کا پکڑے جانا نرالی سی بات ہے۔ مقصود الٰہی شیخ سے خفیہ ایجنسی اہلکاروں نے ۱۸ نومبر ۲۰۰۸ء کو رات کے وقت ان کے گھر پہ ملاقات کی۔ برطانوی قانون کے مطابق اپنا تعارف کرایا، اپنے سرکاری کارڈز دکھائے انھیں بتلایا کہ وہ ''ڈیکیٹو'' ہیں۔ پھر ناول کے بارے میں سوالات کیے۔ ازاں بعد ناول ''بیلہ'' ان کے حوالے کر دیا۔ یہ نہیں معلوم کہ وہ بیلہ کی اسٹیٹمنٹ لے چلے تھے یا نہیں اور یہ کہ دورانِ ریمانڈ انہوں نے کیا محسوس کیا، لیکن وہ مطمئن تھے کہ ناول میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ جس سے برطانیہ کی قومی سالمیت خطرے میں پڑ سکے۔ جب آغا گل سے اس صورتِ حال سے متعلق رابطہ کیا گیا تو انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا بقول محمد عابد:

> ''بیلہ بڑی فلرٹ تھی ممکن ہے۔ برطانوی خفیہ ایجنسی سے بھی فلرٹ
> مارتی رہی ہو ورنہ ایک ماہ ان کے پاس کیوں رہی؟ یہ بھی ممکن ہے کہ
> منصور احمد کی پینٹنگ نے انہیں کچھ زیادہ ہی متاثر کر دیا ہو'' (۷۸)

یہ ناول بنیادی طور پر طبقاتی جنگ اور بلوچستان کی عصری تاریخ پر مبنی ہے۔ بلوچستان کو Colonized کر دیا گیا۔ اپنی Geopolitical پوزیشن کے باعث عالمی طاقتوں کی رسہ کشی کا شکار ہے۔ بلوچستان کے نام پر لوگوں نے مال کمایا مگر اسے سمجھا نہ گیا۔ آغا گل نے اس ناول میں بلوچستان کی سیاسی وسماجی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو اجاگر کیا۔ ''بیلہ'' کو پڑھ کر کئی سوالات ذہن میں آتے ہیں، ایک زہریاپن ہے جو روح میں سرایت کر جاتی ہے۔ کچھ الزامات فوجی نظم ونسق کی

گردن پہ بھی زد ڈالتے ہیں، کہ ہمارے ہاں صدیوں سے رائج استبداری نظام نے بلوچستان کے پتھروں کو کچھ زیادہ ہی پتھرایا ہے۔آغا گل نے بلوچستان میں سیاسی صورتحال کی کشیدگی کے سبب اپنے ناول ''بیلہ'' میں چند تشبیہات اور تلخ استعارے بھی استعمال کیے ہیں۔مثلاً لکھتے ہیں کہ

> ''بھوک فوجی حکومت کی طرح ان کے گھر پہ مسلط ہو چکی تھی جس
> سے چھٹکارا پانے کا کوئی طریقہ کوئی وسیلہ نہیں تھا'' (۷۹)

> ''ایسی افسری سے (ظالم بے انصاف حکومت کی) تو محنت مزدوری
> ہی بہتر ہے، کیونکہ مزدوری سے دل مردہ نہیں ہوتا،ضمیر سے تعفن نہیں
> اٹھتا۔۔۔۔۔۔۔'' (۸۰)

> ''میں سرکاری افسر تو نہیں کہ سچ برداشت نہ کر سکوں، میں دلیری سے
> سچ سن سکتا ہوں'' (۸۱)

مصنف نے ناول ''دشتِ وفا'' میں بھی عشق و محبت اور بلوچستان کے تاریخی واقعات کو بھی ساتھ ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔اسی طرح ناول ''بیلہ'' میں بھی کردار ''رحمان'' کا باپ، چچا، اور دوسرے رشتہ داروں نے بلوچستان میں اپنے حقوق اور تحفظ حاصل کرنے کے لیے جانی قربانیاں دیتے ہیں۔آغا گل قبائلی لڑائیوں کے خلاف تحریک اور بے گناہ لوگوں کے مر جانے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> '' بلوچستان میں جدوجہد اور حقوق کے لیے جب تحریک چلی تو اس کے
> والد چچا بھی تحریک میں شامل ہو گئے، پکڑ دھکڑ اور تھرڈ ڈگری سے بچنے
> کے لیے پہاڑوں میں جا پناہ لی اور نو جوانوں کے ساتھ مل کر گوریلا جدوجہد
> شروع کر دی۔مختلف جگہوں پہ انہوں نے SURPRISE ATTACK
> کیے AMBUSH شروع کر دیے ایسی ہی کسی خونی جھڑپ میں وہ بلوچستان
> پر قربان ہو گئے گمنام شہیدوں کی طرح، دو ماہ تک علم ہی نہ ہو سکا کہاں چلے
> گئے۔۔۔۔۔'' (۸۲)

آغا گل نے ''بیلہ'' میں بلوچستان کے مسائل کے حوالے سے قلم اٹھایا اور ان کی نشاندہی کی ہے۔ علاقائی تاریخ، سرداروں کی استحصالی گروہوں کے ظلم و ستم سرکاری اہلکاروں کی نا انصافیاں، معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کا ذکر کیا ہے۔ بلوچستان کے سیاسی حالات کی خرابی کے سبب، سیاسی نظام کی نااہلی کے سبب وہاں کے مقامیوں کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ مصنف اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''بلوچستان میں انسان کم ہیں اور سپاہی زیادہ ہیں'' (۸۳)

''بھائی سڑکوں پہ ہمیں اتارتے ہو، یہاں سانپ اور بچھو اور کنکھجورے
پھرتے ہیں۔ خواتین اور بچے کہاں جائیں نہ وہ گھنٹہ بھر کھڑے رہ سکتے
ہیں۔ نہ ہی اندھیروں میں بیٹھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ تلاشیاں ہوا کرتیں
سوٹ کیس سفری بیگ کھلوائے جاتے مسافروں کو اچھی طرح ذلیل کیا جاتا
۔۔۔۔۔۔۔۔'' (۸۴)

''بیلہ'' ناول کا ہیرو رحمان جو اپنے باپ اور چچا کی طرح جو پہاڑوں میں آزادی حقوق کی جنگ لڑتے شہید ہو گئے وہ بھی ان کی طرح نام پیدا کرنا چاہتا تھا۔ آغا گل نے اس کردار رحمان کے ذریعے اپنے نظریات جو بلوچستان کی کے نظریات ہیں۔ تبلیغ کرنے کی کوشش کی ہے۔ رحمان ایک وقت میں بے بس ہو جاتا ہے۔ جب اس کے والد اور چچا کے زندہ نام سے جانا جاتا تھا۔ ایسے میں رحمان کا مالک سیٹھ شمروز جو غریب پرور ہے، جو انسان کی متضاد خصلتوں کا متاثر کن امتزاج ہے۔ یہ جاندار کردار اعلیٰ سماجی مرتبہ حاصل کے باوجود بے لوث چاہتوں اور بے غرض محبتوں کا استعارہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے توسط سے ایک طرف تو ہمیں بلوچی معاشرے کا سنگلاخ ٹھاٹ بھاٹ اور ظاہری تمدن نظر آتا ہے۔ دوسری طرف تلخ زندگی کا فلسفہ بھی یہی کردار سامنے لاتا ہے۔ سیٹھ شمروز جو رحمان کے آباؤ اجداد کی قربانیوں سے واقف تھا۔ وہ رحمان کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے کہ

'' تمہارا باپ پہاڑوں میں لڑتا ہوا مارا گیا، ہم اس کا احترام کرتے
ہیں۔مگر سو چودہ کوسٹ گارڈز کا افسر بھی تو بن سکتا تھا۔وہ اس نظام
میں شامل ہو کر اس نظام کو بدل بھی تو سکتا تھا'' (۸۵)

بلوچستان میں زیادہ تر انسان جذباتی ہوتے ہیں۔مصنف نے اپنے ناول میں بلوچستانی عوام کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کے ساتھ ہر قسم کے حالات وقت کے ساتھ ساتھ مختلف ہوتے ہیں۔اس لیے بلوچستانی عوام کو چاہیے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیں۔بلوچوں کو چاہیے کہ وہ وسیع تر مفاد میں سوچنا سیکھیں۔اگر اقتدار میں آنا ہے تو صاحب اقتدار لوگوں میں شامل ہوں نہ کہ ناراض ہو کر پہاڑوں کا رخ کر لیں۔جیسے بلوچستان کے نامور افسران جن میں عطا اللہ ولہاری، اکبر خان کاکڑ، عبداللہ خان جمالدینی، کمال خان شیدانی اور بیسوں دوسرے تعلیم یافتہ نوجوان جو اس علاقے کی تقدیر بدل سکتے تھے۔انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی۔بطور احتجاج ملازمتیں چھوڑ دیں اور نظریاتی تعلیم دینے لگے،لیکن کہاں ہے اب وہ نظریاتی تعلیم؟ بھوک رہتی ہے، پیاس رہتی ہے نظریات نہیں رہتے۔بلوچستان کے عوام کو چاہیے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے جدوجہد کریں۔آغا گل ناول 'بیلہ'' میں لکھتے ہیں کہ

'' کاش سارے بلوچستانیوں کی رگوں سے خون نکال کر مصلحت پسندی
بھر سکتا مگر کوچ کی ٹنکی نہیں جسے خالی کیا جا سکتا ہے۔۔۔'' (۸۶)

اسی حوالے سے ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ

'' اب کی بار پہاڑوں کے بجائے شہروں میں لڑا جائے، بندوق سے نہیں
قلم سے، علم کے زور سے۔۔۔۔'' (۸۷)

آغا گل کے ناول'' بیلہ'' میں طبقاتی تصادم کی فضا بھی جا بجا نظر آتی ہے۔مثلاً ناول میں ایک مقام پر ڈرائیور رحمان کی کوسٹ گارڈز سے لڑائی ہو جاتی ہے۔جو مسافروں کو خواہ مخواہ تنگ کرتے اذیت میں مبتلا کرتے تھے۔معاملہ طول پکڑ گیا، ایسے میں سیٹھ شمروز اسے سمجھاتا ہے کہ

''شیر کی مرضی انڈہ دے یا بچے، وہ ہمارے ان داتا ہیں۔ ہمارے
مالک ہیں، ہم غلام وہ حاکم۔ ہم محکوم، ہم ان کی رعیت ہیں۔ جو چاہیں
کریں ان سے جھگڑا وارے میں نہیں ہے'' (۸۸)

طبقاتی تصادم کے حوالے سے مصنف ناول ''بیلہ'' میں ایک جگہ پر قومی زبان اردو اور بین الاقوامی زبان انگریزی جو انگریز حکمرانوں کے توسط سے ہمارے ہاں رائج ہوئی لکھتے ہیں کہ

''حاکم کبھی محکوموں کی زبان نہیں بولتے۔ حاکم ہماری زبانوں کو
بھی مقامی زبانیں کہہ کر ایک طرف پھینک چکے حالاں کہ یہ قومی
زبانیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔انگریزی میں ہی ہماری بقاء ہے۔ اسی
کے ذریعے ہم حاکموں میں شامل ہو سکتے ہیں'' (۸۹)

ناول ''بیلہ'' دیہاتی کلچر کا بہترین نمونہ ہے۔ ''دشتِ وفا'' کی طرح ''بیلہ'' میں بھی آغا گل نے غریب طبقے کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔ ناول کا ہیرو غربت زدہ ماحول میں پلا بڑھا۔ ان کے ہاں غربت نے اسی دن ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ جب اس کے والد اور چچا پہاڑوں میں لڑنے چلے گئے تھے۔ ماں نے ایک ایک کر سارے زیور بیچ ڈالے جو دلہن بننے پر اسے پہنائے گئے تھے۔ اس نئی نویلی دلہن نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ آٹے کے بدلے میں سارے گہنے پاتے فروخت کرنے پڑیں گئے۔ رحمان کی گھریلو صورتحال کو مصنف نے یوں بیان کیا ہے کہ

''ایک دن جب کھانے کو کچھ نہیں تھا، دوپہر میں بھوک شدید ہوگئی۔
رحمان تو بھوکا ہی مرجاتا مگر ماں اور دادی کے لیے دوکان پہ گیا، تین کلو
آٹا مانگا، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔۔۔۔، تین کلو آٹا تلا تو۔۔۔
۔۔رحمان آٹا لے کر گھر کی جانب مڑا تو دوکاندار نے للکارا پیسے کہاں ہیں؟
رحمان کی آنکھیں بے نور ہو گئیں، بابا آئے گا تو پیسے دے گا، رحمان نے
بے بسی سے التجا کی۔۔۔'' (۹۰)

مصنف نے ناول میں شہری اور دیہاتی زندگی پر بھی گہری نظر دوڑائی ہے۔شہر اور دیہات آپس میں گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ان کا تفاوت ختم ہو چکا ہے۔گٹر لائن کی طرح آپس میں غلط ملط ہو چکے ہیں۔کوئی نہیں معلوم کر سکتا کہاں سے شہر شروع ہے اور کہاں دیہات ختم۔لیکن آغا گل نے اس تہذیبی خطے کو ذرا الگ زاویے سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''بلوچستان کے مکین ۱۰ ہزار سال قبل سے بھی کافی تہذیب یافتہ تھے
جب کے دیگر خطوں کے باسی غاروں میں رہتے تھے۔یہاں کے
مکینوں نے گھر تعمیر کیے۔ان کا اپنا نظام تھا جس کے تحت فیصلے کیے
جاتے یہی لوگ ہجرت کر کے موہنجودوڑو میں آباد ہوئے۔۔۔'' (۹۱)

ناول ''بیلہ'' میں ایسے سماجی بہکاوے ہیں جو قاری کی اس سوچ کو بھسم کرتے چلے جاتے ہیں جو اس نے بلوچی تہذیبی و تمدنی روایات کی بابت ذہن میں چھوڑ رکھی ہے۔آغا گل کے بیشتر ناولوں اور افسانوں میں براہوئی زبان اور رسم و رواج کو بیان کیا گیا ہے۔اس علاقے میں پرورش پانے والے قبائلی سوچ اور رسم و رواج کے بارے میں لکھا۔بلوچستان میں خواتین خاص طور پر عمر رسیدہ عورتوں کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ان کی عزت کا خیال رکھا جاتا ہے۔اس کی ایک جھلک ناول نگار نے ''بیلہ'' میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔مثال کے طور پر ''بیلہ'' میں رحمان کوچ ڈرائیوری کر رہا تھا۔اچانک رات کے ڈھائی تین بجے سمندری حدود کی سڑک پر چند کوسٹ گارڈز نے کوچ کے لوگوں کی چیکنگ کرنے کے لیے کوچ سے نیچے بلوایا۔اس سے کوچ ڈرائیور رحمان اور کوسٹ گارڈز کے درمیان لڑائی ہوگئی۔مصنف اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

'' بلوچستان میں خواتین کا خاص احترام ہے۔کوئی بلوچستانی تصور
بھی نہیں کر سکتا کہ کسی خاتون کو رات دو بجے کے قریب جگایا جائے
اسکی تلاشی لی جائے،اس سے بات کی جائے یہاں تک کہ باپ بھائی

بھی رات کے وقت بہنوں، بیٹیوں کے کمروں میں جاتے نہیں۔اس

وجہ سے بارہا جھگڑے ہوا کرتے۔۔۔۔'' (۹۲)

آغا گل نے شادی بیاہ سے متعلق اقدار وروایات جو بلوچستان کی ثقافت کا حصہ ہیں،''بیلہ'' میں ان کی عکاسی بھی کی ہے۔بلوچستانی معاشرے میں لوگ اپنی روایات کا سختی سے خیال رکھتے ہیں۔رحمان بیلہ کو ڈاکٹر سرور کے کہنے پر انگوٹھی پہنانے کا ارادہ کرتا ہے۔مصنف اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''۔۔۔۔۔۔دور سے ہی Applied For Registration نظر

آئے۔یوں بھی بلوچستان میں منگنی اور نکاح کا درجہ برابر ہے۔۔۔'' (۹۳)

ناول کا مرکزی کردار رحمان ایک بے حد محنتی، چابکدست، فرض شناس اور اپنے پیشے سے محبت کرنے والا روایت پسند کوچ ڈرائیور تھا۔رحمان کو جب بیلہ سے محبت ہوئی تو وہ اس سے روز ملنے کا خواہشمند بھی ہوتا ہے لیکن روایت پسند ہونے کی وجہ سے گھبراتا ہے۔۔بیلہ کئی بار ناراض بھی ہوئی کہ زمانہ بدل گیا ہے اب یہ سب پرانے رواج ہیں کب تک مستونگی روایات کا بوجھ لیے پھریں گے۔

مصنف نے ناول کی کہانی بلوچستان کے قبائلی نظام اور براہوئی طرز معاشرت کی پیچیدہ رسم ورواج کے تانے بانے سے مرتب کی ہے۔جس میں وہاں کی عوامی زندگی کے مختلف مسائل اجاگر کر کے ان کے تدارک کی طرف اربابِ اقتدار کی توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔ان لوگوں میں کبھی شہنشاہیت اور بادشاہت نہیں رہی۔بلکہ ہر آدمی آزاد ہوا کرتا ہے۔اسی وجہ سے بلوچستان میں ہر شخص فطرتاً آزاد طبعیت کا مالک ہے۔اگر اس پر ضرورت سے زیادہ جبر کیا جائے تو وہ نظام کے خلاف ہو جاتا ہے۔مثلاً ناول میں ایک مقام پر مصنف نے لکھتا ہے کہ:

''رحمان ایک جنگجو قوم سے تھا،اس پر آبائی غصہ طاری ہو گیا۔اس

نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔۔۔۔رنچ نکال لیا۔۔۔مسافر پہلے ہی بدتمیز

سٹاف کے خلاف تھے۔۔۔۔انہوں نے سٹاف پر پتھراؤ کا فیصلہ

کیا۔اچکزئیوں کا سسٹم سے زنجیر والوں سے لڑنے کا پرانا تجربہ تھا

بلوچستان میں سنگسار کرنے کے پتھروں کی کیا کمی ہے۔مسافرMOB
میں تبدیل ہو چکے تھے۔جلدی جلدی پتھر اٹھالیے۔۔۔۔" (۹۴)

بلوچستانی ثقافت میں روایات کا احترام اور پاسداری ہر فرد پر فرض ہے۔بلوچستان میں لوگ باگ اپنے وعدے وعید کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔وعدے کی تکمیل میں جان تک جوکھوں میں ڈال دی جاتی ہے۔بعض صورتوں میں جان سے ہاتھ تک دھونے کے واقعات ملتے ہیں۔لیکن اپنی زبان سے نہیں پھرتے ہیں مثلاً

"تمہاری دادی نے مرتے دم مجھ سے قرآن پر عہد لیا تھا کہ میں
زندگی بھر تمہاری حفاظت کروں گا۔۔۔۔۔۔'یہ ایک براہوی کا
وعدہ ہے'شمروز نے سینے پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھائی میرے جیتے جی
رحمان کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی" (۹۵)

ہر معاشرے میں چند ایسی خاص صفات ہوتی ہیں جو اسے دیگر معاشروں سے ممتاز کرتی ہیں۔آغا گل کے ناول"بیلہ"میں بھی بلوچستانی ثقافت کو اجاگر کیا گیا ہے۔اور ان خصوصیات کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔مثلاً وفاداری ایک ایسی صفت ہے جس پر بلوچستان کے باسیوں کو فخر حاصل ہے۔وہ اس صفت پر ناز کرتے ہیں۔ناول میں ایک کردار خدو جو اپنے استاد کی خاطر قتل کا الزام اپنے سر لے لیتا ہے۔کیونکہ اسے اپنے استاد سے بہت محبت ہوتی ہے وہ نہیں چاہتا کہ اس کے استاد کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے۔مصنف اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"خدو سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔۔۔۔۔انہیں میں نے قتل کیا ہے
خبردار استاس کا نام نہ لینا۔۔۔۔۔خدو تمہیں پھانسی ہوجائے
گی،ایک ہمدرد گھبرایا،ہوجانے دو یہ کون سی بڑی بات ہے۔۔
۔۔۔۔" (۹۶)

آغا گل نے ''بیلہ'' ناول میں بلوچستان کے تہذیب وثقافت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔اور یہ امران کے تینوں ناولوں میں نظر آتا ہے۔لیکن آغا گل کے ہاں یہ خوبی بکثرت نظر آتی ہے کہ وہ فرسودہ روایات کی پاسداری نہیں کرتے ۔ بلکہ ان کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ بلوچستان میں اور تیسری دنیا میں ملکیت کے تصور کے حوالے سے مصنف رقم طراز ہے:

'' ملکیت کا تصور قدیم قبائلی سوچ کی نشانی ہے۔عورت کو شادی کر
کے کھونٹے سے باندھنے کا تصور فوجی حکومتوں کی طرح صرف تیسری
دنیا میں ہی رہ گیا ہے'' (۹۷)

ایک اور خامی جو بلوچستان کی ثقافت کا لازمی عنصر ہے ۔وہاں قتل کا بدلہ قتل کی روایت ہے۔یہ غیر منطقی اقدامات بلوچستان کے قبائل کے رسم ورواج کا حصہ ہیں ۔اسے غیرت کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے جب تک بدلہ نہ لے لیا جائے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا جاتا۔رحمان بلوچ روایات کے مطابق اپنے مربی شمروز کے بیٹے کا قاتل بنا۔جبکہ اس سے قبل بیلہ نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانا۔یہ جملہ اسی کا غماز ہے:

''براہوئی ہوں دشمن سے بدلہ لینا میرا ایمان ہے'' (۹۷)

قبائلی رسم ورواج کے مطابق رحمان نے مکمل وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔لیکن قاتل کے بیٹے کا خون بلاجواز اور بے حد غیر منصفانہ ہے۔کیونکہ یہ ایک معصوم کو اس کے والد کے کیے ہوئے جرم کی سزا دیتا ہے۔یہ رسم غلط ہے،اور اسے صرف شعور تعلیم سے ہی بدلہ جا سکتا ہے۔

آغا گل نے بلوچستان کے سیاسی نظام کے سبب پھیلنے والی معاشرتی برائیوں اور خرابیوں کی بھی اپنے ناول ''بیلہ'' میں نقاب کشائی کی ہے۔مثلاً اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''کوسٹ گارڈز کی بندوقیں تو بس دکھاوا ہیں۔ڈراوا ہیں،انہیں
بندوق چلانے کا کوئی تجربہ نہیں۔۔۔۔۔رشوت خور ہیں۔۔۔
۔۔۔'' (۹۸)

بلوچستان میں کوئٹہ سے لے کر کراچی تک پھیلے علاقوں کے بس اڈوں میں ہوٹلنگ عام ہے۔ہوٹلوں میں چائے پینا،گپیں ہانکنا عام ہے۔اس ناول میں بھی ہوٹلوں اور چائے کا ذکر ہر جگہ دکھائی دیتا ہے یا پھر مصنف چائے کے خود بہت شیدائی ہیں۔مثال کے طور پر خضدار ہوٹل،قلات کا ہوٹل، جھنگی ہوٹل،بینچہ کے علاقے کا ہوٹل،سوراب ہوٹل،وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔جہاں رحمان اور کوچ کا عملہ چائے یا کھانا کھاتے تھے۔چائے پینے کا عمل بہت زیادہ بلوچستان کے ہوٹلوں اور ماحول میں عام ہے۔مثلاً

''رحمان چپ چاپ چینکی ہوٹل میں جا بیٹھا۔کوئلوں پر چینکیں دھری تھیں۔پانی ابل رہا تھا۔فضا میں دھویں اور چائے کی پتی کی ملی جلی خوشبو تھی۔کوئٹہ آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا۔۔۔۔'' (۹۹)

بلوچستان میں خاص طور پر ہوٹلوں اور کوچ میں گانے بہت شوق سے سنے جاتے ہیں۔براہوئی گیتوں اور بھارتی اداکاروں ،موسیقاروں کا ذکر بھی بلوچستان کے نچلے طبقے میں دکھائی دیتا ہے۔ناول ''بیلہ'' میں مصنف نے کچھ اس طرح سے تصویر کشی کی ہے کہ

''۔۔۔۔۔سارے گانے وہ اور بیلہ گا رہے ہیں۔کشور کمار، ہیمنت، مکیش اسے اپنے قریبی رشتے دار لگتے تھے۔اگر کبھی لتا کوئٹہ آتی تو رحمان اس کے لیے پورا کوچ خالی کر دیتا۔اسے کوچ میں سیر کراتا، جہاں کہتی لیے پھرتا اور دربار ہوٹل کے نمکین روسٹ کھلاتا۔۔۔۔۔'' (۱۰۰)

آغا گل نے ناول ''بیلہ'' میں بیانیہ انداز اختیار کیا ہے۔مصنف نے علمی باتوں کو علمی طریقے سے ہی ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔مکالمے سادہ زبان، آسان اور بات دلچسپ ہوتی ہے۔وہ اپنے کرداروں سے بھاری بھرکم الفاظ ادا نہیں کرواتے

بلکہ عام بات عام لفظوں میں ادا کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ کسی بھی ناول کی نمایاں خوبی اس کے ایسے کردار ہیں جو بول چال، عادات واطوار حرکات وسکنات سے معاشرتی ماحول کے عکاس ہوں۔ ''بیلہ'' کا مرکزی کردار بلوچستان کی سنگلاخ زمین سے کشید کیا گیا ہے۔ وہ کوچ ڈرائیور ہے اس کے تمام افعال واعمال سے بھی ڈرائیوری جھلکتی ہے۔ طرز اسلوب کا یہ انداز بے مثال ہے۔ مثلاً

''بوڑھے کی آنکھیں پرانے ٹائروں کی طرح میلی سی'' (۱۰۱)

''جس طرح میں اپنا کوچ خود چلاتا ہوں اپنے غم بھی خود ہی
ڈرائیو کرتا ہوں۔۔۔۔۔ زندگی کا کربناک روٹ ختم ہونے
کا نام ہی نہیں لیتا'' (۱۰۲)

آغا گل کے ناول ''بیلہ'' میں طنز ومزاح کی ایک زیریں لہر ہر جگہ موجود ہے۔ جب لوگوں کو اپنے مسائل کی سمجھ بوجھ آنے لگتی ہے اور ان مسائل کی بنیادی وجوہات کو جان لیتے ہیں۔ طاقت اور وسائل کی کمی کے سبب وہ ان کا حل تو نہیں نکال سکتے ایسے میں وہ اس صورتحال کو مزاحیہ انداز میں لیتے ہیں مثلاً

''جہاں سرسوتی ہو وہاں لکشمی نہیں آتی، جہالت کب مرے گی؟
مزید سوال ہوا۔۔۔۔ ایک قہقہہ بلند ہوا، رحمان نے فقرہ کسا،
بلوچستان میں آکر مرجائے گی، بھوک سے، پیاس سے، پولیس
کی مار پیٹ سے، جھوٹے مقدموں سے، لیویز پولیس، ملیشاء
پولیس، بلوچستان کانسٹیبلری سبی سکاؤٹس سے۔۔۔۔۔'' (۱۰۳)

ناول اور افسانے دونوں میں آغا گل نے بھرپور مشاہدے اور وسیع تجربے سے بلوچستان کے ماحول کو کامیابی سے پیش کیا ہے۔ بلوچستان کے معاشرے کے رہن سہن، رسم ورواج، عقائد، اساطیر کی منظر کشی کرکے اپنے ایک خاص قسم کے نقطہ نظر

سے علاقوں کی پسماندگی سے جا ملایا ہے۔ انور سدید اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

'' بلوچستان کی روح کو سمونے اور اس خطے کے انسانوں کی خارجی
اور داخلی زندگی کو کرداروں کے وسیلے سے پیش کرنے کی سعی کی
ان کا فن ایک مخصوص علاقائی کلچر کی نمائندگی کرتا ہے'' (۱۰۴)

حوالہ جات:

۱) علی عباس حسینی، تلخیص تہذیب تعارف، اسلم عزیز درانی، ڈاکٹر، ناول اور ناول نگار، کاروانِ ادب، ملتا، ۱۹۹۹ء، ص ۱۳،۱۴

۲) ایضاً

۳) ایضاً

۴) ایضاً

۵) وقار عظیم، ڈاکٹر، ''داستان سے افسانے تک''، اردو مرکز، لاہور، ص ۵۷

۶) وقار عظیم، ڈاکٹر، ''داستان سے افسانے تک''، اردو مرکز، لاہور، ص ۷۷

۷) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، '' آج کا اردو ادب''، قمر گھر، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۹۱

۸) عزیز احمد، ڈاکٹر، ''ترقی پسند ادب''، حیدر آباد، ۱۹۵۳ء، ص ۳۴

۹) فاروق عثمان، ڈاکٹر، ''اردو ناول میں مسلم ثقافت''۔ بیکن بکس، ملتان، ص ۳۱۰

۱۰) ایضاً

۱۱) ایضاً، ص ۳۳۰

۱۲) شہزاد منظر، ''پاکستان میں اردو ناول کے پچاس سال''، مضمون مشمولہ، ''پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال''، عبارت، اسلام آباد، ص ۳۱۷

۱۳) غنی پرواز، ''بلوچی فکشن کی ابتداء اور ارتقاء''، ''دف''، کوئٹہ، مئی تا اگست، ۲۰۱۱ء، ص ۱۲۲

۱۴) مبارکہ حمید، ''بلوچستان میں اردو افسانے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، اوپن لائبریری، ۱۹۹۸ء، ص ۶۷

۱۵) انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، ''بلوچستان میں اردو ادب کے سو سال''، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۷

۱۶) انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، ''بلوچستان میں اردو ادب کے سو سال،'' مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۰

۱۷) محمد مصلح الدین، ماہنامہ روشناس، آغا گل نمبر، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۷

۱۸) ایضاً، ص ۲۰

۱۹) ایضاً، ص ۲۲

۲۰) آغا گل، غیر مطبوعہ سوانحی مضمون، ص ۷

۲۱) آغا گل ''دشتِ وفا''، لاہور، کلاسیک چوک ریگل مال، ۱۹۸۲ء، ص ۳۸

۲۲) ایضاً، ص ۴۸، ۴۷

۲۳) ایضاً، ص ۵۲

۲۴) ایضاً، ص ۴۷

۲۵) ایضاً، ص ۴۷

۲۶) ایضاً، ص ۱۳

۲۷) ایضاً، ص ۴۰

۲۸) ایضاً، ص ۲۱

۲۹) ایضاً، ص ۴۲

۳۰) ایضاً، ص ۶۸

۳۱) ایضاً، ص ۴۹

۳۲) ایضاً، ص ۶۱

۳۳) ایضاً، ص ۲۲

۳۴) ایضاً، ص ۱۶۸

۳۵) ایضاً، ص ۱۰۱

۳۶) یضاً، ص ۱۰۲

۳۷) ایضاً، ص ۱۱۲

۳۸) ایضاً، ص ۱۰۰

۳۹) ایضاً، ص،۱۵۵

۴۰) ایضاً، ص ۱۴۷

۴۱) ایضاً، ص ۱۲

۴۲) ایضاً، ص،۶۳

۴۳) ایضاً، ص ۹۲

۴۴) ایضاً، ص ۵۸،۵۷

۴۵) ایضاً، ص ۱۱

۴۶) ایضاً، ص ۲۲

۴۷) ایضاً، ص ۶۴

۴۸) ایضاً، ص ۱۱۰

۴۹) شفیق احمد شفیق، پس ورق، ''بابو'' از آغا گل، مکتبہ الحمراء، لاہور، ۲۰۰۴ء

۵۰) آغا گل، ''بابو''، رنگِ ادب پبلیشر، کراچی، جنوری، ۲۰۱۱ء، ص ۷

۵۱) ایضاً، ص ۸

۵۲) ایضاً، ص ۵۷

۵۳) ایضاً، ص ۹

۵۴) ایضاً، ص ۹

۵۵) ایضاً، ص۱۱

۵۶) شفیق احمد شفیق، پس ورق، ''بابو'' از آغا گل، مکتبہ الحمراء، لاہور، ۲۰۰۴ء

۵۷) آغا گل، ''بابو''، رنگِ ادب پبلیشر، کراچی، جنوری، ۲۰۱۱ء، ص ۸، ۹

۵۸) ایضاً، ص۱۸

۵۹) ایضاً، ص ۱۸

۶۰) ایضاً، ص ۹۰

۶۱) ایضاً، ص ۷۰

۶۲) ایضاً، ص ۵۴

۶۳) ایضاً، ص ۹۰

۶۴) ایضاً، ص ۱۶، ۱۷

۶۵) ایضاً، ص ۹۳

۶۶) ایضاً، ص ۳۳

۶۷) ایضاً، ص ۱۶

۶۸) ایضاً، ص ۱۱

۶۹) ایضاً، ص ۹

۶۹) ایضاً، ص۲۰

۷۰) ایضاً، ص ۷۵

۷۱) شفیق احمد شفیق، پس ورق، ''بابو'' از آغا گل، مکتبہ الحمراء، لاہور، ۲۰۰۴ء

۷۲) ایضاً، ص۷۷

۷۳) طفیل اختر، ''آغا گل کے افسانوں کی دنیا اب تک ۔۔''، مکتبہ الحمراء، لاہور، ص ۴۵

۷۴) ایضاً، ص ۶۲

۷۵) آغا گل، ''غیر مطبوعہ سوانحی مضمون، ص ۱۰

۷۶) فرخ صابری، ''بیلہ کا خصوصی مطالعہ''، ماہنامہ روشناس، کراچی، جلد نمبر ۱۴، نومبر، ۲۰۱۱ء، ص ۲۸

۷۷) ایضاً،

۷۸) خالد یوسف، ''آغا گل کا ایک مہماتی ناول''، بیلہ''، روزنامہ باخبر، کوئٹہ، ۱۸ مارچ، ۲۰۰۹ء

۷۹) محمد عابد، اقتدار ملت، راولپنڈی، ہفتہ، ۱۴، مارچ ۲۰۰۹ء

۸۰) آغا گل، ''بیلہ''، ادارہ الحمراء ادارہ، لاہور، ۲۰۰۴ء

۸۱) ایضاً، ص ۲۰

۸۲) ایضاً، ص ۲۳

۸۳) یضاً، ص ۷۴

۸۴) ایضاً، ص ۲۰،۱۹

۸۵) ایضاً، ص ۹۴

۸۶) ایضاً، ص ۶۰

۸۷) ایضاً، ص ۶۸

۸۸) ایضاً، ص ۶۰

۸۹) ایضاً، ص ۳۴

۹۰) ایضاً، ص ۵۵

۹۱) ایضاً، ص ۷۴

۹۲)　ایضاً،ص ۹۳

۹۳)　،آغا گل غیر مطبوعہ سوانحی مضمون،ص۹

۹۴)　آغا گل،''بیلہ''،ادارہ الحمراءادارہ،لاہور،۲۰۰۴ء

۹۵)　ایضاً،ص ۵۸،۵۹

۹۶)　ایضاً،ص ۱۰۰

۹۷)　ایضاً،ص ۶۱

۹۸)　ایضاً،ص ۱۲۹

۹۹)　ایضاً،ص ۱۴۰

۱۰۰)　ایضاً،ص ۷۸

۱۰۱)　ایضاً،ص ۱۱۳

۱۰۲)　ایضاً،ص ۶۰

۱۰۳)　ایضاً،ص ۴۰

۱۰۴)　ایضاً،ص ۵۹

۱۰۵)　ایضاً،ص ۴۴

۱۰۶)　ایضاً،ص ۶۲

۱۰۷)　ایضاً،ص ۶۱

۱۰۸)　انور اسدی،''بیلہ''،از آغا گل۔ص۹۲

باب سوم:

اردو افسانہ نگاری کی روایت

اردو افسانے کی روایت:

اردو میں شارٹ سٹوری کے لیے مختصر افسانے کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔مختصر افسانہ بھی ناول کی طرح مغرب سے آیا ہے۔اور اتنی ہی تیزی سے پروان چڑھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہی نثر کی تمام اصناف پر حاوی ہو گیا۔اردو میں مغربی انداز کا افسانہ تو نہ تھا لیکن داستان، کہانی اور حکایت کے روپ میں اسکی روایت پہلے سے موجود تھی۔بقول وقار عظیم

''فسانۂ آزاد اور باغ و بہار کے بعض اجزاء کو الگ الگ کر کے دیکھا
جائے تو ان کے اندر بعض جگہ مختصر افسانہ چھپا ہوا نظر آتا ہے۔'' (۱)

افسانے کی کوئی قطعی، جامع اور واضح تعریف نہیں کی جا سکتی۔افسانے کے بارے میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ پڑھتے وقت افسانہ ہی معلوم ہو ناول یا داستان نہ لگے۔مختلف لوگوں نے افسانے کی مختلف تعریفیں کیں ہیں مثلاً

''افسانہ ایک مکمل تجربے کا نام ہے۔یہ تجربہ پوری زندگی پر محیط
ہو سکتا ہے اور زندگی سے متعلق ایک لمحے پر بھی'' (۲)

''افسانہ زندگی کا ایک رخ، ایک جھلک، ایک جذبہ، ایک واقعہ
پیش کرتا ہے۔یا ایک تجربے سے جتنے جذبات پیدا ہوتے ہیں
ان کو بیان کرتا ہے۔'' (۳)

اردو افسانے پر ایک اچٹتی نظر:

اردو افسانے کی باقاعدہ روایت کا آغاز بیسویں صدی کے ساتھ اس وقت ہو گیا تھا، جب سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند نے اس میدان میں قدم رکھا۔ہر چند کہ اس سے قبل کہانی کسی نہ کسی شکل میں اردو میں موجود رہی تھی۔قدیم داستانیں اور فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں اس کی واحد مثال نہیں ہیں۔بلکہ سرسید احمد خان نے جو انشائی ادب لکھا مثلاً امید، بحث و تکرار، تربیت اطفال، سراب حیات وغیرہ ان میں واقعاتی عناصر دیکھے جا سکتے ہیں۔سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند نے کم و بیش ایک ہی زمانے میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔یلدرم ۱۹۰۰ء میں اور پریم چند نے ۱۹۰۱ء میں لکھنا

شروع کیا۔سجاد حیدر یلدرم نے افسانے ایک خاص نقطہ نظر کے تحت لکھے۔ان کے افسانوں میں رومانوی رجحان غالب ہے۔جبکہ پریم چند نے حقیقت نگاری کا راستہ اختیار کیا۔اس طرح اردو افسانے کی ابتداء میں دو واضع رجحانات ملتے ہیں۔رومانیت اور حقیقت پسندی کا، پروفیسر احتشام حسین کے بقول:

"یہ اردو افسانے کی خوش قسمتی ہے کہ دو بہت ہی اچھے فنکار اس کو ابتداء سے ہی مل گئے، پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم دونوں نے اسے گھٹنوں پر چلنے سے بچالیا اور شروع میں ہی جوان بنا کر پیش کر دیا" (۴)

سید معین الدین کی تحقیق کے مطابق:

"اردو کا پہلا افسانہ پریم چند کا "انمول رتن" نہیں بلکہ یلدرم کا "نشہ کی پہلی ترنگ" ہے۔اس لیے کہ خود پریم چند کے بیان کے مطابق ان کا پہلا افسانہ زمانہ ۱۹۰۷ء میں موجود ہے" (۵)

پریم چند کے افسانوں کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے حقیقت، واقعیت، تصوریت میں ایک خاص امتزاج پیدا کیا۔پریم چند کے افسانے ان کے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں۔پریم چند کی پیروی کرنے والوں میں علی عباس حسینی، اوپندر ناتھ اشک، عظیم بیگ چغتائی، حیات اللہ انصاری، سدرشن، سہیل عظیم آبادی، راشد الخیری، ترقی پسند کہلانے والے منٹو، غلام عباس، ممتاز مفتی وغیرہ شامل ہیں۔جب ترقی پسند ادب عروج پر تھا، کہ رومانوی مکتبہ فکر نے جنم لیا۔جس کے بانی سجاد حیدر یلدرم تھے۔قاری کو خیالی دنیا کی راہ دکھاتے ہیں۔یلدرم کا پہلا مجموعہ "خیالستان" ۱۹۱۱ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے کے افسانوں میں خاص طور پر "سودائے سنگین"، حکایہ لیلی مجنوں، اور خیالستان اور گلستان وغیرہ نے اردو افسانے کے قاری کو ایک نئے طرح کے مزاج سے آشنا کیا۔ان کے افسانوں میں رومان اور محبت کا جذبہ، مناظر فطرت کی رنگینیوں سے مل کر ایک دنیا بناتا ہے۔

یلدرم کی پیروی کرنے والوں میں نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری، امتیاز علی تاج، مہدی آفادی، حجاب امتیاز علی، اور سلطان حیدر جوش وغیرہ شامل ہیں۔ جب برطانیہ کو پہلی جنگ عظیم کا سامنا ہوا۔ تو ہندوستان کی سیاست میں تبدیلی آنے لگی۔ روس میں اشتراکی انقلاب آ چکا تھا۔ برصغیر کے سماج پر صنعتی ترقی کے اثرات پڑنے لگے تھے۔ پریم چند کے افسانوں میں سماجی موضوعات کی اہمیت بڑھنے لگی۔ دوسری طرف ہندوستان کا بدلتا سماجی ماحول بھی لکھنے والوں پر اثر انداز ہوا۔ اس دوران ''انگارے'' جیسی کتاب منظر عام پر آئی۔ جس نے پوری اردو دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ ''انگارے'' کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ

> ''ایک سوشل ازم کا تصور اور دوسرے تحلیل نفسی اور جنسی زندگی
> پر کھل کر اظہار کرنا، ان دونوں کی بنیاد آپ ''انگارے'' کے
> افسانوں میں ایک طرف سوشل ازم کی آواز اٹھتی ہوئی معلوم ہوتی
> ہے۔ دوسری طرف فرائڈ ازم اور جنسی بھوک اور جنسی گھٹن کا تصور
> پوری طرح مسلط ہے۔'' (٦)

دس افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ سجاد ظہیر کی پانچ کہانیاں، احمد علی کی دو، رشید جہاں کی ایک کہانی، اور ڈراما، محمود الظفر کا ایک افسانہ شامل ہیں۔ اس مجموعہ کی کہانیوں میں ہر جگہ آزادی اور بے باکی اور پردہ داری کی جگہ پردہ دری ہے۔ ان افسانوں میں موضوع اور فن کے اعتبار سے ایک باغیانہ روش پائی جاتی ہے۔ جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا، اس کے ساتھ ہی اردو افسانے کا ایک زریں عہد کا آغاز ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کرشن چندر، منٹو، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، بلونت سنگھ وغیرہ سامنے آئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اردو افسانہ:

قیامِ پاکستان پرامن طریقے سے نہیں ہوا۔ یہ مصائب وآلام کی ایک الم ناک داستان ہے۔شعروادب پر بھی خاص طور پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب اردو افسانہ خاص طور پر مقبولیت کے عروج پر پہنچا۔قیام پاکستان کے بعد افسانوں میں فسادات کے علاوہ ہجرت کے موضوع کو بھی برتا گیا ہے۔ہمارے جو افسانہ نگار ان علاقوں سے نقل مکانی کر کے آئے تھے ان کی تحریروں میں ان علاقوں کی یادیں ہیں۔گزرے ہوئے لوگ، چھوڑی ہوئی بستیاں اور وہ تہذیبی اقدار جن میں ان کی پرورش ہوئی تھی ان کی تحیروں میں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔

فسادات کے موضوع پر لاتعداد کہانیاں لکھی گئیں ۔ان میں لاتعداد ایسے افسانوں کی تھی جو واقعاتی یا حادثاتی تھے۔ان میں تخلیقی جذبہ اور فن کا حسن مفقود تھا لیکن پھر بھی کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی ،حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، عزیز احمد، احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب، انتظار حسین وغیرہ کے کچھ افسانے واقعاتی، حادثاتی بلکہ وقتی موضوع سے متعلق ہونے کے باوجود حسن اور فنکاری کے بہترین نمونے ہیں۔اس عہد کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد احسن فاروقی لکھتے ہیں کہ

> 'فرقہ ورانہ فسادات کے موضوع پر لاتعداد افسانے لکھے گئے۔ان میں ایسے افسانے بھی تھے، جن میں جذباتیت کا وفور تھا۔اور اس نے افسانے کی تکنیک، تراش خراش، اور تانے بانے پر برا اثر ڈالا تھا اور افسانے جذباتی نظم ہو کر رہ گئے تھے'' (۷)

البتہ بعض ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اردو افسانے کا بھرم ہی نہیں رکھا۔ بلکہ اس کا اعلیٰ معیار بھی قائم کیا۔اس ضمن میں پاکستان میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی اور بھارت میں راجندر سنگھ بیدی، اور کرشن چندر کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو، فسادات کے حوالے سے اہم نام ہیں۔احمد ندیم قاسمی کا ''پرمیشر سنگھ'' کو

بڑی اہمیت حاصل ہے۔قدرت اللہ شہاب کے افسانے''یا خدا'' کو بھی اسی موضوع کے سبب شہرت حاصل ہوئی۔ان افسانوں کے علاوہ بھی بہت اچھے افسانے لکھے گئے جن میں سید انور کا''ظلمت''ممتاز مفتی کا''ثمینہ'' خدیجہ مستور کا ''تین عورتیں''اشفاق احمد کا''گڈریا'' شامل ہیں۔

تقسیم کے بعد کے حالات پر کرشن چندر کے افسانوں کے کئی مجموعے''ہم وحشی ہیں''،''شکست کے بعد'' ،تین غنڈے، پانی کی دریافت وغیرہ شائع ہوئے۔راجندر سنگھ بیدی کا''لاجونتی''اہم ہیں۔جب ہم علامتی افسانے کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کے آغاز کے کئی اسباب ہمارے سامنے آتے ہیں۔پہلا سبب تو یہ کہ ترقی پسند تحریک پر پابندی عائد ہو جانے کے سبب جدید نظریات کو فروغ مل گیا۔دوسرا جب مارشل لاء نے اظہار آزادی پر پابندی عائد کی تو علامتوں کا سہارا لینے کی ضرورت پیش آئی۔

پاکستان میں علاقائی افسانے کا باقاعدہ آغاز انتظار حسین اور انور سجاد سے ہوتا ہے۔۶۰ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں خالدہ حسین بھی علامتی افسانہ نگار کے طور پر سامنے آئیں۔ ۶۰ء کی دہائی میں چونکہ تمام تر ادب میں نئی تبدیلیاں وقوع پزیر ہورہی تھیں۔اس لیے افسانے کے اس نئے رجحان کو مقبولیت حاصل کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔بیانیہ انداز میں لکھنے والے افسانہ نگاروں میں علامت نگاری سے اپنا تعلق جوڑا۔جن میں منشایاد، سمیع آہوجہ، احمد جاوید، ڈاکٹر رشید امجد، وغیرہ شامل ہیں۔بہرحال افسانہ نگاری یہاں آکر رک نہیں گئی۔

کئی ایسے صاحب علم افسانہ نگار بھی سامنے آئے جنھوں نے مروجہ رجحان کے مطابق جہاں علامتی افسانے لکھے، وہاں کہانی کی روایت کو اس طرح سے آگے بڑھایا کہ زبان و بیان کی ولاقائی و مقامی رنگ میں رنگ ڈالا۔ پاکستانی افسانے کے موجودہ دور میں جو افسانہ نگار سامنے آئے۔ان میں شمس آغا محمود سعید خان، اصغر ندیم سید، شمع خالد، مرزا اظہر بیگ، نیلوفر اقبال، فردوس حیدر، مبین مرزا کے نام قابل ذکر ہیں۔آغا گل کی تکنیک اس لحاظ سے منفرد ہے کہ جس نے اپنی مہارت سے بلوچستان کی ساری تصویریں اپنے مکمل سماجی، تاریخی اور روایتی، پس منظر کے ساتھ اردو میں بے ساختہ انداز میں پیش کی ہیں۔نسیم درانی نے آغا گل کو بلوچستان کا پہلا اور آخری افسانہ نگار قرار دیا ہے۔آغا گل کی تکنیک

اس لحاظ سے منفرد ہے جس نے اپنی مہارت سے بلوچستان کی ساری تصویریں اپنے مکمل سماجی ،تاریخی،اور روایتی پس منظر کے ساتھ اردو میں فطری اور بے ساختہ انداز میں فٹ کی ہیں۔

کمال کی بات یہ ہے کہ آغا گل کو علامت کی اہمیت اور افسانے میں اس کے کردار کا مکمل ادراک ہے۔اگر چہ اس کی کہانی اپنی جگہ پر پورا ابلاغ لے کر آتی ہے لیکن اس کی علامتوں کو بنیاد بنا کہانی کی تفہیم کی جائے تو مرکزی خیال کے نئے معنی کہانی کے رگ و پے میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

گورپچ:

''گورپچ'' کا پہلا افسانہ ''ٹرن ٹیبل'' ہے۔جو شامل کتاب ہوئے اس سے قبل 'افکار کراچی مارچ ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

''ٹرن ٹیبل'' کہانی پن پر پورا اترتا ہے۔اس افسانے میں آغا گل نے سب سے پہلے ایک ماحول بنایا ہے اور قاری کو اس ماحول کا حصہ نانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔جس میں ان کے خاموش شہر اور طویل دن کے ذکر کے علاوہ ''چینکی ہوٹل'' کا بیان قاری کو کوئٹہ کے ایسے ماحول میں لے جاتا ہے جو کہ حقیقت ہے اور قاری اپنے آپ کو ماحول کا حصہ سمجھتا ہے۔بلوچستان کی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہوٹلنگ ہے جو ہمیں آغا گل کے بیشتر ناولوں اور افسانوں میں کثرت سے دکھائی دیتا ہے۔افسانہ ''ٹرن ٹیبل'' میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ

> ''ہماری ایک ہی تفریح تھی کہ سر شام ہوٹل میں جا بیٹھتے (بلوچستان میں ریسٹورانٹ کو ہوٹل کہا جاتا ہے) یہ ہوٹل کلچرل سینٹر ہوا کرتے تھے'' (۸)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ

''ایک شام جب سرد ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں بجلی کوند
رہی تھی۔۔۔۔نشاط ہوٹل میں گیتوں کا طوفان تھا، سگریٹوں کا
دھواں تھا۔گالیوں اور قہقہوں کا ہجوم تھا، سخت دوستانہ فضا تھی۔۔
۔۔وہ اکثر نشاط ہوٹل میں بیٹھ کر افسانے لکھتا۔ہوٹل کا قیامت خیز
شور، بازار کا ہنگامہ کچھ بھی اسے ڈسٹرب نہ کرتا۔۔۔۔'' (۹)

آغا گل نے افسانے ''ٹرن ٹیبل'' میں ادب کے حوالے سے بلوچستان میں جو سرگرمیاں انجام پاتی رہیں ان کا ذکر بھی بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے کسی بھی ملک ،معاشرے ،علاقے کی تہذیب وثقافت کا عکاس ان کا ادب ہوتا ہے۔آغا گل بلوچستان میں بننے والی ادیبوں کی انجمنوں اور ادبی ایمانداری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''ایک بار ادیب دوستوں نے میرے ساتھ شام منانے کا فیصلہ کیا
نام کی مناسبت سے اسے 'شامِ گل' کا نام دیا گیا۔۔۔۔آرتھر نے
تقریر کے دوران ذرا دوستی کا پاس نہ کیا۔اور میری تحریروں پر خوب
تنقید کی۔۔۔۔بلوچستان میں ادیبوں کی انجمن قبیلہ بنی تو ریٹائرڈ منٹ
کے قریب سرکاری افسر محکمہ تعلیم کے حکام ،محمود وایاز بھی شامل ہو گئے'' (۱۰)

بلوچستان کی تاریخ میں دوست اور دوستی کی خاطر جاں جوکھوں میں ڈالنے، جان قربان کرنے کی ہزاروں زندہ مثالیں موجود ہیں۔بلوچستان کے باسی دوست اور دوستی کو مضبوط رشتے کی حیثیت سے سمجھتے ہیں۔اور ایسے میں دوست کے ساتھ دوستی میں دھوکا دہی کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔آغا گل اس حوالے سے افسانہ ''ٹرن ٹیبل'' میں لکھتے ہیں کہ

''چشتی نے پندرہ روزہ 'عکس بولان' جاری کیا تو آرتھر کو اخبار کا ایڈیٹر
بنا دیا، معاملہ دوستی کا تھا۔آرتھر نے کوئی معاوضہ طلب نہ کیا۔۔۔۔
چشتی کے قلم کی کاٹ بہت تیز تھی۔۔۔آرتھر کو مخالفین نے آفر دی کہ اگر
وہ چشتی کے خلاف بیان دے تو اسے دس ہزار کا نذرانہ پیش کیا جائے گا

--چشتی---تم آرتھر کو مجبور کرو میرے خلاف بیان دے---اسے
روپے کی سخت ضرورت ہے آرتھر---مقروض ہوں مگر اپنے دوست کو دھوکا
نہیں دے سکتا غربت میرے لیے نئی چیز نہیں---'' (۱۱)

بلوچستان میں مے خواری کی رسم پرانی اور عام ہے۔ بلوچستان میں نشہ آور اشیاء کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ لوگ باگ کھلے عام ان اشیاء کو استعمال کرتے۔ اس معاشرے میں یہ کوئی بڑی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جب اسلامی نظام ملک میں رائج ہوا تو دوسرے صوبوں کی طرح بلوچستان میں نشہ آور اشیاء اور مختلف معاشرتی برائیوں کے سد باب کے اقدامات کیے گئے۔ قانون کا نفاذ کیا گیا اور اس پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی کوششیں کی گئیں۔ لیکن اقلیتوں کے لیے نشہ آور اشیاء کے استعمال کے لیے مخصوص کوٹہ سرکاری طور پر نافذ کیا گیا۔ مصنف لکھتے ہیں کہ

'' آرتھر بھی ہمارے عام شاعروں، ادیبوں کی طرح پیتا تھا، معلوم
نہیں یہ کیوں فرض کر لیا گیا کہ شاعر یا ادیب کے لیے مے خوار ہونا
ضروری ہے---- جب ملک میں اسلامی نظام رائج ہوا---بار
بند ہو گئے، طوائفوں کے اڈے ختم کر دیئے گئے---آرتھر غیر مسلم تھا
----مگر یہ کوٹہ اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت ہوا----'' (۱۲)

اقلیتوں نے اس قدم پر رضامندی کا اظہار کیا۔ اور ملکی سلامتی کو اولین ترجیح دی۔ آغا گل نے ساتھ ہی افسانہ ''ٹرن ٹیبل'' میں جہاں اس معاشرتی برائی کو سرکاری سطح پر اور حکومتی سطح پر ممنوع قرار دینے کے حوالے سے تحریر کیا اور ساتھ ہی اس حوالے سے بھی لکھا کہ نجی سطح پر شراب نوشی کی صنعت نے جنم لیا کیونکہ شراب کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ پینے والوں کی تعداد کافی تھی۔ کاروباری حوالے سے منافع کمانے کا بہترین موقعہ تھا۔ مثلاً

'' آرتھر نے وہ دن دیکھے تھے جب کوئٹہ ڈسٹلری سے تیس روپے میں
شراب کی بوتل مل جاتی، کہاں اچانک وہی بوتل تین سو روپے میں
ملنے لگی۔ ایسے میں کچھی، نصیر آباد کی صدیوں پرانی شراب سازی کی

صنعت انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔۔۔۔پلاسٹک کی تھیلیوں اور چیری
کینوں میں فروخت ہونے لگی۔۔'' (۱۳)

آغا گل نے اپنے اس افسانے ''ٹرن ٹیبل'' میں انسانی نفسیات اور زندگی کے فلسفہ کو بھی بیان کیا ہے۔افسانے کا نام ''ٹرن ٹیبل'' بھی اسی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔آغا گل ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

''زندگی کیا ہے؟۔۔۔۔جب کسی انجن کا رخ بدلنا ہو تو اسے ٹرن ٹیبل
پر کھڑا کر دیتے ہیں۔لیور کی مدد سے ٹرن ٹیبل گھما کر اس مہیب انجن کا
رخ دوبارہ اسی جانب موڑ دیا جاتا ہے۔انجن کی پوری زندگی ٹرانزٹ
۔۔۔ہماری زندگی بھی ان اسٹیم انجنوں کی طرح ہے۔۔۔انجن
کی طرح ہماری اور ہالٹنگ بھی نہیں ہوسکتی۔۔۔۔ٹرن ٹیبل ایک بے رحم
دیوتا ہے۔۔۔۔'' (۱۴)

''ٹرن ٹیبل'' آغا گل کا ایک ایسا (SOLO CHARACTER) افسانہ ہے۔جسے بلا خوف تردید عالمی ادب کے کسی بھی پلیٹ فارم پر بطور ماڈل رکھا جا سکتا ہے۔اگرچہ افسانے کی ساری بنت آرتھر جاوید کے کردار کا احاطہ کرتی ہے۔لیکن جس طرح کوئٹہ کے ریلوے کے طریقہ کار، ریلوے کالونی اور شہر میں ہوٹلوں کی نوعیت اور وہاں استعمال ہونے والی معروف اصطلاحات کو آغا گل نے بیان کیا ہے۔پورا شہر اور اس کا تہذیبی پسِ منظر کاغذ پر سجا کر رکھ دیا ہے۔

عام مشاہدے میں آتا ہے کہ تخلیق کار خصوصاً ادیب جس شعبے سے وابستہ ہوں اسے اپنے تخلیقی وجود کا حصہ نہیں بناتے۔صحافی کبھی تخلیقی کام میں اپنے شعبۂ صحافت کو نہیں لائے گا خواہ اس کا باعث اپنے شعبے میں مسلسل رہنے کی وجہ سے بوریت یا اکتاہٹ یا پھر کوئی خوف کہ کیچڑ میں پتھر پھینکنا عبث اپنے کپڑے داغدار کرنا ہوتا ہے۔کچھ بھی ہو مگر آغا گل جو محکمہ ڈاک کے ایک اعلیٰ افسر رہے ہیں۔ان کی یہ خوبی بھی سامنے آئی ہے۔کہ انہوں نے اپنے شعبے میں جو خامیاں دیکھیں ان کا برملا اظہار کر دیا ہے۔ادبی ایمانداری اس وقت ثابت ہوئی ہے جب وہ یہ جملہ برملا اور روانی سے لکھ جاتے ہیں۔

''پوسٹ آفس والے یوں بھی ذرا جلد ہی پریشان ہو جاتے ہیں بلکہ

عادتاً ہی پریشان رہتے ہیں'' (۱۵)

آغا گل نے اس افسانے میں خیال کو کہانی نہیں بلکہ واقعے کو کہانی بنایا ہے۔ اپنے افسانے ''ڈاک خانہ گکڑ'' میں بلوچستان میں معاشی صورتحال کو بھی بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

''ڈیرہ غازی خان نیم صحرائی SEMI DESERT شہر تھا

سویا سویا سا، پرسکون شہر، مگر وہاں بھی روزگار کے مواقع مسدود

تھے۔ وہاں کے مقامی لوگ بھی ملازمت کے لیے بلوچستان جایا

کرتے تھے'' (۱۶)

کہانی کا مرکزی کردار قمرالدین ہے جو تقسیم ہند کے وقت امرتسر سے ہجرت کر کے پاکستان کے مختلف شہروں سے ہوتا ہوا لورالائی جا پہنچا۔ لورالائی کے نواح میں کلمی بخماء میں جا بسا اور قمرو کے نام سے مشہور ہوا۔ غربت، جہالت اور مہاجریت نے اس سے اس کا اصل نام بھی چھین لیا۔ افسانہ ''ڈاک خانہ گکڑ'' میں مصنف ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

''غربت کے سانچے میں ڈھلے اس انسان کو قمرو کہا جانے لگا'' (۱۷)

مہاجرین اپنی بسی بسائی دنیا اس لیے چھوڑ کر آ گئے کہ پاکستان دارالسلام ہوگا۔ اسلام کا قلعہ ہوگا، لیکن یہاں مہاجرین کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس دن کے لیے قربانیاں دیں، جان و مال اور عزت کی۔ وہاں تو نماز پڑھنے پر پابندی نہ تھی۔ کہاں ہیں روزگار کے برابر مواقع، اسلامی بھائی چارہ، کیا یہ سب نعرے تھے؟ اگر پردیس میں چپڑاسی گیری کرنا ہوتی تو پھر وطن کیا برا تھا۔ معاشی و معاشرتی مسائل کے علاوہ ایک بڑا مسئلہ پہچان کا تھا۔ جس کا مہاجرین کو ہر مقام پر سامنا کرنا پڑا۔ وہ عجیب جذباتی بحران سے گزر رہے تھے۔ مقامی لوگوں کا رویہ ان سے انتہائی ناقابل برداشت تھا۔

''مقامی لوگوں نے قمرو کی تقرری پر اعتراضات بھی کیے۔۔۔

آپ نے باہر کا آدمی لگایا ہے، مقامی لوگوں کی حق تلفی ہے۔۔۔

مظلوم ہے۔۔۔اس نے پاکستان کے لیے قربانی دی ہے۔۔۔

تو ہم پر کیا احسان کیا ہے؟ یہ سب چھوڑ چھاڑ کر یہاں آیا ہے، ہم

نے کیا کارڈ بھیج کر دعوت دی تھی۔۔۔'' (۱۸)

آغا گل نے اپنے افسانے ''ڈاک خانہ کگز'' میں بلوچستان کے جغرافیہ اور وہاں کے مکینوں کے مزاج کو بھی بیان کیا ہے۔ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

''قمر الدین نے فورٹ منرو سے گزر کر رکھنی جا بسیرا کیا۔۔۔گھومتے

پھرتے لورالائی جا پہنچے۔لورالائی بلوچستان کا چھوٹا سا شہر ہے، اصل

نام تو بوری ہے، مگر جانے کیوں لورالائی کے نام سے مشہور ہو گیا

لوگ طبعاً سادہ مزاج دوستانہ تھے۔موسم خوشگوار تھا۔۔۔۔۔کلی

(گاؤں) نخماء میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔۔۔۔مٹی

کی چھت والا کچا مکان تھا'' (۱۹)

آغا گل نے بلوچستان کی تہذیبی ترقی کے حوالے سے بھی ''ڈاک خانہ کگز'' میں لکھا ہے۔بلوچستان میں قائم ہونے والے پوسٹ آفس کا حوالہ بھی دیا۔مصنف لکھتے ہیں کہ

''زیارت پوسٹ آفس جو ۱۹۱۳ء میں قائم ہوا تھا اور ترقی کرتے

کرتے آٹھ آدمی کے اسٹف پر جا پہنچا جہاں مورس لائن کا پورے

انڈیا سے لنک تھا۔۔۔'' (۲۰)

''ڈاک خانہ کگز'' میں مصنف نے نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے کہ کس طرح ہجرت کے بعد مہاجرین کو مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان مسائل میں سیاسی، سماجی ومعاشی ومعاشرتی مسائل سرفہرست تھے۔ایک جگہ پر قمرو کی نفسیاتی صورتحال کو یوں بیان کیا ہے۔کہ حالات کا اس پر کیا اثر ہوا ملاحظہ کریں

''میں کون ہوں؟ قمر الدین یا قمر ورفیوجی، نان لوکل یا لوکل میں
کہاں کا لوکل ہوں؟ کس زمین کو اپنا کہوں؟۔۔۔۔۔۔ذات کے
ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں سے کسے اپنا کہاں۔۔۔۔'' (۲۱)

آغا گل کا افسانہ ''دوسری بابری مسجد'' ایک کامیاب اور خوبصورت افسانہ ہے۔ یہ افسانہ بلوچستان کے پسِ منظر میں سوچا اور لکھا گیا ہے۔ جو کہانیاں سوچ کر لکھی جاتی ہیں وہی اپنے پڑھنے والوں کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ آغا گل کی کہانیاں ایسی ہی ہیں۔ بقول طفیل اختر (ایڈیٹر ماہنامہ مسکراہٹ) آغا گل کے افسانوں میں بلوچستان دھڑکتا ہے، بالکل دل کی طرح، جس سے زندگی آگے بڑھتی ہے اور میرا نھامنا فلسفہ یہ ہے کہ دل ہے تو دنیا ہے، آغا گل کا دل بلوچستان ہے۔

افسانوی مجموعہ ''گورپچ'' کے دیگر افسانوں کی نسبت یہ افسانہ ''دوسری بابری مسجد'' محبت کے جذبے کو زیادہ پر اثر انداز میں بیان کرتا ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ جس قدر بھی اس افسانے میں تاریخی، مذہبی، علاقائی حوالے دیئے گئے ہیں۔ وہ سب ایک محبت کی داستان کو مزید تقویت دینے کے لیے ہیں۔ منظر کشی محبت کی اس داستان کو یادگار بنا دیتی ہے۔ آغا گل اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ

''بابر۔۔۔بچپن میں کیسے جا کر خان رند کے قلعے کی شکستہ فصیلوں
پر۔۔۔۔چڑھ جاتا اور زور زور سے آوازیں دیتا گھنی پریوں
میں شاخ در شاخ گھومتا اس کے ڈوپٹے میں بیر پھینکتا۔۔۔۔'' (۲۲)

''دوسری بابری مسجد'' افسانے کی کہانی دراصل سیوی میں پلنے بڑھنے والے شیل اور بابر کی محبت کی کہانی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار بابر ہے اور شیل اس کی ہیروئن ہے۔ بابر کے بچپن سے شیلا کماری پر فدا ہونے کے واقعے سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جب بابر جہاد کرنے کی غرض سے ہندو محلّہ پر حملہ کرتا ہے۔ کم سنی میں اسے یہ پتا چلتا ہے کہ کافروں کو مارنا ثواب ہے۔ آغا گل نے افسانے میں بلوچ ثقافت کی خصوصیات کو بیان کیا کہ بابر کو اس کے والد مہر اللہ خان نے سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اسلام میں اور ہم بلوچوں میں کسی پڑوسی کو ستانا بہت بڑا گناہ

ہے'' (۲۳)

بلوچ ثقافت کی ایک اور خوبی کا ذکر بھی زیرِ نظر افسانے میں ملتا ہے۔ بلوچستان میں باھوٹ (زیرِ پناہ) کی کیا اہمیت ہے۔ باھوٹ یا میار جلی یعنی کسی شخص جو کسی ذاتی دشمنی یا قبائلی جنگ کے سبب کس کے ہاں پناہ لے۔ بلوچوں کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے کیونکہ کمزور شخص اپنی حفاظت دفاع نہ کر سکنے کے سبب کسی دوسرے فرد یا قبیلے کے ہاں میار بن جاتا ہے۔ اور وہ فرد، قبائل کسی شرط، معاوضے کے بغیر اس کی جان و مال کی حفاظت کرتی ہیں، بلکہ اسے وہ قومی فرض سمجھتے ہیں:

''تم ہندو ہو، ہمارے باھوٹ (زیر پناہ) ہو۔ تمہیں جنگ میں

جھونکنا ہمارے دین کے خلاف ہے ہاں مسلمان ہوتے تو ٹھیک

تھا۔۔۔۔'' (۲۴)

بلوچ ثقافت کی خوبیاں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ خامیاں اور منفی رویوں کا ذکر بھی اس تحریر میں ملتا ہے۔ مثلاً اس حوالے سے افسانہ ''دوسری بابری مسجد'' میں ایک مقام پر کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ:

''بلوچستان میں سب سے بڑا دشمن ہی سیال (کزن) ہوا کرتا

ہے۔ تبھی بلوچی کا محاورہ ہے، سیال چہ سیالاں کم بود گوش ہائے

بر'' کزن سبقت نہ لے جائے ورنہ تو اپنا کان کاٹ ڈالو'' (۲۵)

آغا گل نے اپنے بیشتر ناولوں اور افسانوں میں بلوچستان کی ثقافت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ آغا گل نے بلوچستان کے قبائلی روایات، رسم و رواج کا بیان بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے کہ مشکل حالات میں بھی وہ اپنی روایات پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ اس حوالے سے آغا گل افسانہ ''دوسری بابری مسجد'' میں لکھتے ہیں کہ جب بابر پر قاتلانہ حملہ کیا گیا اور اس کے موردِ الزام ہندو ٹھہرائے گئے اور مسلمان قبائل نے بدلہ کی خاطر اسلحہ سے لیس ہو کر مہر اللہ خان کی حویلی میں مجمع

اکٹھا کیا افسانہ نگار لکھتا ہے:

''ان کی حویلی دیکھتے ہی دیکھتے فوجی چھاونی میں تبدیل ہوگئی۔
مہراللہ خان ان تمام چیزوں کے خلاف تھے۔ مگر قبائلی رواج کے
مطابق سب کا استقبال کرنے پر مجبور تھے'' (۲۶)

''دوسری بابری مسجد'' اس افسانے میں مذہبی تنازعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار بابر ہندو لڑکی شیل سے شادی کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ لیکن مذہب کی رکاوٹ راہ میں حائل ہوتی ہے۔ بابر کے والد اسے سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ

''شیل سے تمہاری شادی میرے اختیار سے باہر ہے۔
میرے ایک اشارے پر قتل وغارت ہوسکتا ہے، قاتلوں
کو خریدی جاسکتی ہے۔ مگر یہ نہیں ہوسکتا۔ شیل بھی مذہب
تبدیل نہیں کرے گی ۔۔۔۔ روی شنکر کی برادری میں کیا
عزت رہ جائے گی؟ ۔۔۔۔'' (۲۷)

اس افسانے میں ہندوستان میں بابری مسجد کے متعلق بلوچستان میں ہونے والے فسادات کے واقعات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ کہ ان فسادات کا اثر بلوچستان میں کیا ہوا کیسے کیسے حالات وواقعات رونما ہوئے وغیرہ مثلاً اچانک سیوی میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ ہندوستان میں بابری مسجد کا واقعہ جس نے بلوچستان جیسے پرسکون علاقے میں بھی دھوئیں، راکھ، انگاروں کی بارش ہونے لگی۔ دنیا بھر کے مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی۔ اجودھیا کے ہندو بابری مسجد کو مندر میں بدلنا چاہتے تھے، سیوی میں بھی لوگ مشتعل ہوگئے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں ان کے درمیان فساد برسوں جاری رہا۔ بلوچستان میں تہذیبی ترقی کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو برطانوی حکومت میں گورنر بمبئی، جنرل ٹمپل کو زبردستی سیوی بھجوایا گیا تا کہ درۂ بولان سے ریلوے لائن گزارنے کے امکانات کا جائزہ لے۔ روس کی وجہ سے درۂ بولان اور درۂ خیبر کی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر

برطانوی حکومت نے ایک سوایک دن میں ریلوے لائن جوسیوی سے سندھ تک ۱۳۲ میل تھی مکمل کر لی۔سیوی میں ۱۴ جنوری ۱۸۸۰ء کودھواں اگلتا ہوا انجن داخل ہوا۔

''دوسری بابری مسجد'' اس افسانہ کو پڑھ کر مختلف موضوعات سامنے آئے ہیں۔جن میں سیاسی نظام کی ناقص کارکردگی کا موضوع بہت اہم ہے۔موجودہ دور معاشی جنگوں کا دور ہے۔دنیا بھر میں حکمران فوجیں ہیں جب کہ ہمارے ہاں فوج خاص دنوں میں شہروں یا ریڈ اسکوائر میں پریڈ کر کے فرائض سے سبکدوش ہو جاتی ہے۔اور اسی ناقص نظام کی وجہ سے پر امن شہریوں کو سیاسی پارٹیاں اپنے ذاتی مفادات کی خاطر استعمال کرتی ہیں اور انہیں مختلف مسائل سے دوچار کرتی ہیں۔

آغا گل کی وسعت علمی کا اس افسانے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے،مثلاً تاریخ کے حوالے سے انہوں نے لکھا کہ مغل یا منگول کا لفظ منگ سے بنا ہے۔جس کا مطلب ہے خون آشام سلاطین دہلی یا مغلیہ حکمران جو اپنے صاحبزادوں کو بینائی سے محروم کر دیتے۔بھائیوں کی کھال اتروا دیتے۔کسی بھی شہنشاہ یا بادشاہ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ،انہوں نے تزکِ بابری کے حوالے سے بھی لکھا کہ شہنشاہ بابر کا بھی مذہب سے برائے نام تعلق تھا بے شک تزکِ بابری پڑھ کے دیکھ لیں کہ وہ اپنے بارے میں کیا کچھ لکھتا ہے۔آغا گل کو نہ صرف مختلف زبانوں بلکہ مختلف مذاہب مثلاً ہندو،عیسائی مذاہب کی تعلیمات پر بھی کافی حد تک آگاہی حاصل ہے۔مثلاً آغا گل مسیحیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> ''یسوع نے جواب میں ان سے کہا۔خدا پر ایمان رکھو میں تم سے
> سچ کہتا ہوں کہ جوکوئی اس پہاڑ سے کہہ دے اکھڑ جا اور سمندر میں
> جا پڑ اور اپنے دل میں شک نہ کرے بلکہ یقین کرے جو کچھ کہے یا وہ
> کہتا ہے وہ ہو جائے گا۔۔۔۔۔'' (۲۸)

ہندو مذہب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''شیل کے ذہن میں سانکھیہ یوگ کے تقویت بخش الفاظ گونجنے
> لگتے ،نہ کبھی میں تھا اور نہ تو۔نہ راجے نہ مہاراجے نہ ہم سب کبھی ہوں
> گے جس پر ماترا سپرشی اثر نہیں کرتے۔۔۔۔۔آتما کو نہ ہتھیار کاٹتے

ہیں نہ اس کو آگ جلاتی ہے۔۔۔۔۔'' (۲۹)

مصنف کے بقول یہ ایک طویل افسانہ تھا جو کہ تین سو صفحات پر مشتمل تھا۔ اور اسے انہوں نے ڈیڑھ ماہ میں تحریر کیا۔ اس افسانے میں قطع و برید بھی بعض جگہوں پر نظر آتی ہے۔ خاص طور پر جب بابر آرمی میں گیا۔ تو اس کے بعد کی تفصیلات وضاحت طلب ہیں بس جنگی مشق کا لکھا گیا ہے۔ جبکہ بابر کا زخمی ہونا دوسری دفعہ اور پھر اس کا ہسپتال پہنچنا بھی وضاحت طلب ہے۔ جب کہ صرف ہبرگ کا حملہ ہے اور حملے کے بعد شیل کا اسے لینے جانا اور اس وقت آپریشن ہو چکا ہوتا ہے۔ بابر کے سوئم پر جس وفد نے دوسری بابری مسجد کی تجویز پیش کی تھی وہ وفد اگر ہندوؤں کا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ میرے خیال میں بابر نے مندر کی سیڑھیوں پر جان دے کر ہزاروں لوگوں کی جان بچائی تھی اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو اس نے مذہب کی خدمت کی تھی اور اسی حوالے سے اگر ہندوؤ کہتے تو افسانے کا یہ اچھا کلائمکس ہوسکتا تھا مگر شیلا کماری کی ناگہانی موت پھر بھی اس افسانے کو جاندار کر گئی۔

فکشن کی یہ خوبی ہے کہ فکشن نگار اپنی کہی بات کا ایسا جواز پیدا کرتا ہے کہ جو فکشن کے قاری پر اثر کرے۔ اور اس کو حقیقت تصور کرے۔ افسانہ نگار جو بات کہنا چاہتا ہے اس کے لیے عمارت رفتہ رفتہ تعمیر کرے اور آخری منزل پر اپنی بات بیان کر دے۔ آغا گل نے اپنے افسانے ''کباڑی بازار میں عمارت تعمیر کی ہے۔ جس کی ایک ایک اینٹ بڑی احتیاط سے نصب کی اور پھر وہی آخری منزل پر بات کہہ دی ہے۔

آغا گل نے ڈاک خانہ ککڑ، دوسری بابری مسجد کی طرح اس افسانے میں برصغیر کی تقسیم کے بعد کے حالات کی عکاسی کی ہے۔ کہ تقسیم کے بعد بلوچستان میں موجود مسلمانوں کو کیسے کیسے حالات پیش آئے کیسے اداروں میں بدنظمی اور معاشرتی برائیوں نے جنم لیا۔ اس حوالے سے آغا گل اپنے افسانے ''کباڑی بازار'' میں لکھتے ہیں کہ

''کسٹوڈین سے مل ملا کر لوگوں نے اونے پونے متروکہ جائیدادیں
خریدلیں یہ پہلا محکمہ تھا جس نے قیام پاکستان کے ساتھ رشوت اور
لوٹ مار کی بنیاد رکھی۔ سیٹھ فتح محمد خان نے کوئٹہ شہر کا خاصہ بڑا حصہ خرید
لیا۔ سبزی منڈی میں ایک بڑا سا مسافر خانہ بنوادیا'' (۳۰)

معاشی بدحالی اوراس سے پیدا ہونے والے حالات وواقعات کا ذکر افسانے میں کچھ اس انداز میں سامنے آتا ہے۔

"سیٹھ کے اخراجات پر دن میں دو یا تین بار روٹیاں مفت تقسیم ہوتیں
غریب غربا، پردیسی، افغان مہاجر صبر و تحمل سے خیرات کا انتظار
کرتے مگر جونہی تقسیم کا عمل شروع ہوتا وہی پر سکون بے ضرر لوگ
وحشی بن کر روٹیوں پر جھپٹتے۔۔۔۔۔شرفاء۔۔۔۔گاڑیوں میں بیٹھے
یہ منظر بڑی دلچسپی سے دیکھتے حکمران طبقہ صدیوں سے لڑا کر محظوظ
ہوتا ہے۔ آریانہ سہی شہر کے بازار سہی۔۔۔" (۳۱)

اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ترکوں میں بھی یہ رسم تھی کھانا پکا کر غرباء کے آگے رکھ دیتے کیونکہ لوگ اس پر وحشیانہ انداز میں جھپٹتے، مارکٹائی کرتے تھے۔امراء اس منظر سے محظوظ ہوا کرتے اس کو "خوان یغما" کا نام دیا گیا۔

افسانہ "کباڑی بازار" اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک انوکھا، اچھوتا افسانہ ہے۔جس میں یونیورسٹی میں پڑھنے والے دو اعلیٰ طبقوں کے بچے "بیزن" اور "پروانہ" کے ایک مختصر سے معاشقے کو بیان کیا گیا ہے۔بیزن ایک بہت بڑے سیٹھ کا بیٹا ہے۔جبکہ پروانہ ایک اعلیٰ افسر کی بیٹی، جب ان دونوں میں معاشقہ شروع ہوا تو پہلی فرمائش پروانہ نے اپنے عاشق سے یہ کی کہ وہ کباڑی بازار بند کروا دے کیونکہ لوگ استعمال شدہ کپڑے پہنتے ہیں تو اسے بہت برا محسوس ہوتا ہے، یہ انسانیت کی توہین ہے۔آغا گل نے اس افسانے میں معاشرے میں موجود اعلیٰ طبقے کے ساتھ ساتھ پسے ہوئے طبقے کا بھی ذکر کیا ہے۔جس کی عکاسی بہت عمدہ انداز میں کی گئی ہے۔

"کباڑی کی چیزیں استعمال کرنے والے سفید پوش دن میں تو کنی
کترا کر گزر جاتے اور شام میں مفلر یا چنری (کندھے کی چادر)
چہرے پر لپیٹ کر خریداری کے لیے آتے یا گھر کی برقع پوش خواتین کو
بھجواتے" (۳۲)

دنیا بھر میں دو قومیں ہیں ایک حاکموں کی اور دوسری محکوموں کی۔مثلاً سرکس کے شیر کو اگر پیٹ بھر کر کھانا مہیا کر دیا جائے تو وہ کبھی بھی کرتب نہیں دکھائے گا۔ایسے میں وہ پنجرے میں قید نہیں رہے گا۔اور دوسری صورت میں اگر کھانا بند کر دیا جائے

تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔اس صورتحال میں اسے درمیانی کیفیت میں ہی رکھا جاتا ہے تا کہ کام چلتا رہے اور یہی اصل فن ہے۔بنی نوع انسان کی تاریخ بھی یہی ہے۔

اسی طرح اگر لوگوں کی ضروریات کو پورا کیا جاتا رہے تو نہ کوئی حاکمیت رہے گی نہ محکومیت۔ہمارے حکمران اپنا نظام اور اجارہ داری قائم و دائم رکھنے کے لیے عوام کو کباڑی کے سامان پر زندہ رکھتے ہیں تا کہ عام آدمی اسے تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر صابر و شاکر رہے اور ان کی خدمت کرتا رہ گیا۔

بلوچستان میں ۱۹۳۹ء کے زلزلے سے ہونے والی تباہی اور بعد میں ہونے والی تہذیبی ترقی کو بھی بیان کیا گیا ہے۔مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

''سیون ٹائپ کوئٹہ کی اصطلاح ہے۔۱۳ مئی ۱۹۳۵ء کو زلزلے سے شہر مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔نیا کوڈ آف کنسٹرکشن جو انگریزوں نے بنایا اس کے مطابق بانسوں کے اسٹرکچر پر بنی کچی تعمیرات جن پر ٹین کی چھت ہوا سے سیون ٹائپ بلڈنگ کا نام دیا گیا۔۔۔۔'' (۴۳)

افسانہ ''کباڑی بازار'' میں آغا گل نے نظریاتی عکاسی بھی کی ہے۔بیزن پروانہ کے کہنے پر کباڑی بازار بند کرواتا ہے اور حکمران طبقہ اپنے مفادات کی خاطر اسے دوبارہ کھول دیتا ہے۔پروانہ شادی سے انکار کر دیتی ہے کہ اسے کمزور انسان سے تعلق کسی صورت قبول نہیں ایسے میں بیزن پروانہ کو مختلف نظریات،ادبی،سیاسی و معاشی و معاشرتی ہر لحاظ سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔اس سے مصنف کی وسعت علمی کا اندازہ ہوتا ہے

''ہمارے سارے ادبی نظریات،سیاسی و معاشرتی و معاشی بھی تو غیر ملکی اترن ہیں۔ہمارے نظریات یہودی لابی کنٹرول کرتی ہے۔فرائیڈ،کارل مارکس،روسو اور میکاولی کے نظریاتی چیتھڑے ہماری انٹلکچول کلاس کا لباس ہیں۔۔۔۔۔۔غالب کا سارا کلام مال مسروقہ ہے۔۔۔۔برگساں،کانٹ،نطشے،رومی،اقبال کا اپنا کیا ہے،ہمارا سب کچھ کباڑی ہے۔ہمارے فرسودہ نظریات کے

کباڑی بازار ہیں۔۔۔'' (۳۴)

آغا گل افسانے میں بعض اوقات ایک جملہ لکھ کر قاری کو بہت کچھ دے جاتے ہیں۔

''برقع پوش خاتون بھی بغیر نمبر پلیٹ کار کی طرح ہوتی ہے کچھ اتہ پتہ

نہیں چلتا۔۔۔'' (۳۵)

کچھ اور جملے افسانہ نگار کی حس مزاح اور تہذیبی شعور پر روشنی ڈالتے ہیں جیسے

''پروانہ کے ہاتھوں سے شیکسپیر کی ضخیم کتاب گر گئی بیزن نے فوراً کتاب اٹھالی۔

اور دونوں ہاتھوں سے پیش کی جو بلوچستان میں شائستگی کا انداز ہے۔خدا آپ

کو شیکسپیر پڑھنے اور ٹمپسٹ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین، ویسے یہ شیکسپیر بھی

اپنے بلوچستان کا تھا نام شیخ پیر تھا انگریزوں نے بگاڑ کر شکیسپئر رکھ دیا۔۔۔''

(۳۶)

انوکھے موضوع کی وجہ سے افسانہ ''کباڑی بازار'' بہت ہی جاندار افسانہ ہے۔اس افسانے میں مصنف نے دراصل ایک صورت حال کو بیان کر کے آخر میں نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے۔افسانے کی کہانی چونکہ سادہ ہے اس لیے اس سے عام قاری متاثر نہیں ہوسکتا مگر خیال اور نتیجہ قابل قبول ہے جو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

''اسپیڈ بریکر'' کی کہانی ایک سادہ سی کہانی ہے، جس میں مرکزی کردار جو دور سے سفر کر کے آیا اور ڈی اے ناز بن بیٹھا۔نام تو دراصل دراخان تھا مگر یتیمی کے بعد تلاش معاش نے اسے دراخان سے درررو بنا دیا۔تلاش معاش کے لیے وہ کوئٹہ چلا آیا تھا۔بلوچستان کے شہر میں معاشی صورتحال کے بارے میں مصنف لکھتا ہے کہ:

''کوئٹہ بلوچستان کا دل ہے۔حالانکہ ایسے شہروں کو پیٹ کہنا چاہیے کیونکہ

ایسے بڑے بڑے شہر معاشرے کا پیٹ بھرتے ہیں۔یوں بھی دل کے

بغیر تو انسان جی سکتا ہے مگر پیٹ بنا نہیں۔۔۔۔'' (۳۷)

جس سیٹھ کے اینٹوں کے بھٹے پر درررو کام کرتا تھا اس کی ایک اپاہج بیٹی زبیدہ تھی جس کی ایک حادثے میں ایک ٹانگ کٹ

گئی۔اس افسانے میں مردوں کی عورتوں کے بارے میں نفسیات کی گرہ کشائی کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ

''مردوں کی بھی جانے کیا پسند ہے۔کبھی محض دو آنکھوں یا بالوں کی وجہ
سے پوری لڑکی پر مر مٹتے ہیں اور کبھی محض لکڑی کے ایک پاؤں کی خاطر
پوری لڑکی ہی رد کر دیتے ہیں'' (۳۹)

''اسپیڈ بریکر'' اس افسانے میں کھلم کھلا پیغام نمایاں ہے جو دلیری کی جانب راغب کرتا ہے۔اور جہالت کے خلاف جہاد کا پیغام دیتا ہے''اسپیڈ بریکر'' مصنف نے بطور علامت لیا ہے مگر جس انداز میں افسانے میں علامت کو استعمال کیا جاتا ہے ۔آغا گل نے ہرگز نہیں کیا بلکہ اس علامت کو سطح پر لے جانے کے بغیر ہی خود کھول کر بیان کر دیا ہے۔مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

''اسپیڈ بریکر'' پس ماندگی کی علامت ہے۔ہم زندگی اور وقت کی رفتار کو
روکنا چاہتے ہیں اسے سست رفتاری پر مجبور کرنا چاہتے ہیں شہروں میں
جتنے زیادہ اسپیڈ بریکر ہوں گے۔لوگ اسی قدر زیادہ پس ماندہ ہوں گے
غیر محتاط اور سست ہوں گے ان کے ردِعمل انتہائی مجہول ہوں گے'' (۴۰)

آغا گل اپنے افسانوں میں بہت سے سیاسی وسماجی ،تاریخی واقعات کو بطور حوالہ لے آتے ہیں ۔یہ ان کے وسیع المطالعہ ہونے کی دلیل بھی ہے اور واقعات کو برمحل منطبق کرنے کا سلیقہ اور قرینہ بھی جیسے اسپیڈ بریکر میں یونانی مفکر کا حوالہ دیا ہے کہ:

''اسپارٹا کے مفکر نے کہا تھا شہروں کی حفاظت فصیلوں سے نہیں شہریوں
سے ہوا کرتی ہے۔۔۔۔۔اسپارٹا کے لوگوں نے فصیلیں گرا دیں اور پھر
اسپارٹا نے ایک عرصے تک قوموں پر حکومت کی۔۔۔۔۔اسپیڈ بریکر
علامیہ ہے۔۔۔۔۔بلوچستان بھر کو ان اسپیڈ بریکرز سے نجات دلا دیں
اور متمدن قوموں کی صفوں میں لا کھڑا کریں۔۔۔۔'' (۴۱)

اس افسانے میں فلسفیانہ نظریات بھی جا بجا ملتے ہیں جیسے کہ پرائے اصول اپنا کر دانشور محسوساتی دنیا میں جیتے ہیں وہ زندگی نہ مادی ہوتی ہے نہ مکمل غیر مادی برج قوس والی مخلوق کی مانند جس کا نصف دھڑ گھوڑے کا اور نصف انسان کا۔ اسے یا نصف انسان تصور کر لیں یا نصف گھوڑا ہو۔ یقیناً سچائی کڑوی ہوتی ہے۔ اور اس کا برداشت کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، سماج میں موجود زیادہ تر خرابیاں سچ کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

اس افسانے ''اسپیڈ بریکر'' میں بلوچستانی معاشرے میں موجود چھوٹی چھوٹی برائیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بڑی برائیوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ مثلاً افسانے کا مرکزی کردار ناز جسے اسپیڈ بریکر جان سے بڑھ کر عزیز ہوتا ہے۔ اس کی انا وابستہ ہوتی ہے۔ اسکی خاطر وہ رشوت دیتا ہے۔ متعلقہ عملہ کی مٹھی گرم کرتا ہے۔ اس طرح سرکاری ریکارڈ کے مطابق اسپیڈ بریکر ہٹا دیا گیا مگر دراصل موجود رہا۔

''اسپیڈ بریکر'' میں نسوانی کردار زبیدہ یا تو افسانے کے آغاز میں نمایاں ہے یا پھر افسانے کے آخری سطور میں اسکی جھلک نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے زبیدہ جو کہانی کو موڑنے کے لیے تو اہم ہے مگر اس کا کردار دبا ہوا ہے۔

وادیءقاف ''گورپچ'' کا چھٹا افسانہ ہے۔ اس مجموعے میں کل بارہ افسانے ہیں۔ اس لیے اس افسانے کو مجموعے کا وسط کہا جائے گا۔ جس کا مرکزی خیال انگریزی ادب سے مصنف نے مستعار لیا ہے۔

افسانہ 'وادی قاف'' اس مجموعے کا سب سے الگ تھلگ افسانہ ہے۔ جس میں کوئی بھی کردار مقامی نہیں۔ البتہ زمینی حقائق ، پشتون خوا، کوہ سلیمان، غرشین غر یہ وادی قاف یہ سب بلوچستان ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آغا گل افسانے میں لکھتے ہیں

> ''بلوچستان کے جلتے صحراوں کے اس پار پشتون خواہ (شمال
> مشرقی بلوچستان) کے بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ ہے جس میں
> کوہ سلیمان بھی ہے۔۔۔۔شین غر کے سبز بلند پہاڑوں میں ایک
> پراسرار وادی ہے جسے وادی قاف کہتے ہیں'' (۴۲)

افسانے میں ایک انجانا خوف اور سسپنس ہے جو افسانے کو اس قابل بناتا ہے کہ اسے اچھے افسانوں میں جگہ دی جائے۔ ''وادی قاف'' دراصل شین غر کے پہاڑوں میں واقع وادی قاف کی پراسراریت کے متعلق ہے جہاں جو کوئی بھی

گیا وہ زندہ نہ بچا۔ گھنے جنگلوں میں جہاں دھوپ کا گزر بھی نہیں ہوتا۔ جہاں ہر قسم کے خونخوار جانور پائے جاتے ہیں دن رات یہاں ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہیں۔ گھنے سفید بادلوں کی تہ در تہ ٹکڑیاں چوٹیوں پر چھائی رہتی ہیں۔ وہاں جن پریوں کے ٹھکانے ہیں جو ہر آنے والے کی ہلاکت کا سبب بنتی ہیں۔

اس سائنس فکشن میں مصنف نے وسیع بلوچستان کو مزید وسعت دی ہے۔ اور بھوک وافلاس۔ قحط اور سرداروں کے ظلم کے مارے بلوچستان کے بجائے ایک اور رخ افسانہ نگار نے دکھایا ہے۔

اس افسانے ''وادی قاف'' میں بلوچستان میں انگریزوں کی وجہ سے ہونے والی تہذیبی ترقی اور افسانے کی مدد سے بلوچستان کی وہ تاریخ دہرائی ہے۔ جس کو جاننے کے لیے ڈھیروں کتابوں کی ورق گردانی مطلوب ہوگی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''پچھلی صدی کے انگریز توسیع پسندوں۔۔۔۔بلوچستان پر قبضہ کرلیا۔ میجر
> ''سنڈیمن (۱۸۳۵ء-۱۸۹۲ء) نے جسے ازاں بعد نائٹ کا خطاب ملا۔ اپوزئی
> پر قبضہ کرلیا۔ ایک پہاڑی پر اس نے قلعہ تعمیر کیا۔ جو فورٹ سنڈیمن کے نام
> سے موسوم ہوا۔ اس نے رفتہ رفتہ بلوچستان کے ایک اہم شہر کی حیثیت اختیار
> کرلی۔۔۔۔(شہر کا نام تبدیل کرکے اب ژوب رکھ دیا گیا) شین غر کا
> راستہ اسی شہر سے نکلتا ہے'' (۴۳)

افسانہ ''وادی قاف'' میں کہانی کا آغاز نیٹو کے ایک اعلیٰ افسر کی موت سے ہوا۔ جو وادی قاف میں مارا گیا۔ آغا گل نے اپنے افسانوں میں وادی قاف کے حوالے سے کی جانے والی مہم کا ذکر بھی کیا ہے۔ بلوچستان میں غیر ملکی طاقتوں کا عمل دخل جو زمانوں سے رہا ہے اور آج بھی کسی اور صورت میں کام کر رہے ہیں۔ وادی قاف کو تسخیر کرنے والی مہموں کا بھی کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ چلتا رہا۔ مگر اس کا نتیجہ انسانی جانوں کے زیاں، تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ نکلتا۔ امریکن پریس والے چیخ اٹھے کہ ستاروں پر کمند ڈالنے والے ہمالیہ کے پہاڑوں پر جھنڈا گاڑنے والے وادی قاف تک نہ پہنچ پائے۔ چنانچہ یہ کام اقوام عالم نے امریکہ کے خلائی تحقیقی اداروں کو سونپا۔ جسے مختصراً (NASA) کہا جاتا ہے۔

''وادی قاف''اس افسانے پر مذہبی رنگ نمایاں ہے۔وہ اس سے قبل اور بعد کہیں نہیں ہے۔خاص طور پر مذہب کو خدائی اور اخلاقی ضابطہ قرار دیا گیا۔جس کی موجودگی میں کسی قانون کی ضرورت نہیں۔جب تحقیقی ٹیم وادی قاف میں پہنچی وہاں جو مکالماتی انداز روحوں اور انسانوں کے درمیان قانون اور مذہب کے مطالبات پر ہوتا ہے کہ اگر تم لوگ مذہب پر عمل کرو تو قانون بنانے کی ضرورت نہیں۔قانون انسانی چیز ہے کیونکہ قانون جبر ہے اور انسانیت جبر کے خلاف ہے۔قانون طاقت ور کی مرضی کو کہتے ہیں جب کہ مذہب خدائی ضابطہ اخلاق ہے۔

آغا گل کے افسانوں میں جو روشن خیالی دوسرے افسانوں میں نظر آتی ہے اس کے برعکس اس افسانے''وادی قاف''میں مذہب شناسی عیاں ہے۔جیسے روزے کا بیان،علم ارواح کا تصور،آسمانی کتابوں کا ذکر اور اسلام کو سچا ثابت کرنا وغیرہ اہم ہے۔اسے اس طرح بیان کیا ہے:

'' تم نے ذہن اور روح کی پرورش کے بجائے جسم اور جسمانی خواہشات کو پالا
زیادہ کھانے سے جسمانی خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل (میٹابولازم) تیز ہو
جاتا ہے۔اور نتیجتاً انسان جلدی مر جاتا ہے۔انسان زیادہ کھانے سے مرتا ہے
کم کھانے سے نہیں ورنہ تمام مسلمان روزوں میں ہلاک ہو جاتے۔۔۔۔تم
خواہشات کے غلام ہو۔۔۔۔اسے انسانیت نہیں کہتے'' (۴۴)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ

''کرنل ہربرٹ۔۔۔۔ایک پادری کا بیٹا تھا،مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ
کر چکا تھا۔اسلام سے بہت متاثر تھا۔۔۔۔تثلیث کا تصور اس کے ذہن
میں نہیں سماتا تھا۔۔۔۔۔۔لیکن اسلام قبول کرنا اس کے لیے معاشی اور
معاشرتی مسائل پیدا کر دیتا۔۔۔کسی بھی آسمانی کتاب میں کسی ایسی دنیاوی
وادی کا ذکر نہیں۔جہاں روحوں کا بسیرا ہو۔۔۔۔'' (۴۵)

کئی مقامات پر مصنف نے اردو کے ایک دو اہم کا انگریزی مترادف بھی توسین میں لکھ دیا ہے جیسے تابکاری (ریڈی

ایشن)، مدافعتی طاقت (ایمیونٹی سسٹم)، حیاتیاتی زہر (بائیوٹاکسن)، زہریلی جنگ (ٹاکسی کالوجی ل)، قبل از تاریخ (پری سیٹوریک)، دو اطراف (ٹوڈائی مینشن) وغیرہ۔

المختصر یہ افسانہ سائنس فکشن کے حوالے سے آغا گل کا بہترین افسانہ ہے۔ جس میں مذہب کی بالا دستی واضح اور عیاں ہے۔ اس افسانے میں بلوچستان کو مائی بلوچستان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے کو انگریزی ادب سے ماخوز ہے مگر بلوچستان کی سرزمین کی تصویر کشی عمدہ انداز میں کی گی ہے۔

احمد شاہ ابدالی جب بلوچستان آیا تو اس نے یہاں مقیم صرف بلوچ دیکھے۔ اس لیے اس خطے کا نام بلوچستان رکھ دیا گیا پھر اسی نام سے یہ صوبہ مشہور ہوگیا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ اگر اس نے کوئی اور قوم دیکھی ہوتی تو اس کا نام کچھ اور ہوتا۔ ''کورۂ کئی''، جس کا مطلب ہے مٹی کے گھروندے، دراصل یہ افسانہ ایک مٹی کے گھروندے بنانے والے لڑکے پر ہے۔ بلوچستان کی ایک اہم قوم براہوی ہے۔ وہ گھروں میں رہنا اچھا تصور نہیں کرتے۔ ان کے ہاں خیموں میں رہنا اور موسم سے لڑنا بہادری ہے۔

افسانہ ''کورۂ کئی'' ایک ایسے ہی قبیلے سے تعلق رکھنے والے کی کہانی ہے۔ جو گھر بنا کر رہنا چاہتا ہے۔ اور تو اور وہ اس طرح روایت شکنی کرنا چاہتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار فرید ہے جس کے والد نے سب سے پہلے گھر بنا کر روایت توڑی جس پر باقی قبیلے والوں نے سخت برہمی کا اظہار کیا کہ تم لوگوں نے روایت شکنی کی ہے۔ جب اس کے دادا نے کوئٹہ میں ذاتی گھر بنایا تو قبیلے کے سرکردہ افراد ان کے پاس آتے رہے خفا خفا سے کیا تم چھتوں کے نیچے مکدر فضا میں زندگی گزارو گے، مصنف اس حوالے سے لکھتا ہے:

> ''ان کے ہاں چھتوں کے نیچے رہنا معیوب سمجھا جاتا تھا ہزاروں برس
> سے وہ خانہ بدوش زندگی گزارتے چلے آئے ہیں۔ روس، افغانستان،
> بلوچستان، اور تمام شمالی علاقے بلوچستان کے صحرا اور ہندوستان کے

وسیع میدان بھی ان کے اپنے تھے۔۔۔۔۔۔۔ماوان کی زندگی دھرتی
سے نہیں موسم سے بندھی ہے۔۔۔۔تم باپ دادا کی روایت توڑ رہے ہو''

(۴۶)

آغا گل نے اپنے افسانے ''کورئی کئی'' میں بلوچستان میں موجود قبائلی روایات پر طنز بھی کیا ہے مثلاً روایت اس پکے ہوئے پھل کی مانند ہے جسے نہ توڑو تو خود ہی لٹک کر گر جاتی ہے۔ہر شے کی طبعی زندگی ہے اور روایت اس سے مبرا نہیں ہوسکتی ہے۔یہ افسانہ روایت شکنی کا عکاس ہے لیکن وہیں مصنف ان روایات کا ذکر بھی کرتے ہیں جن کو نبھانا ازبس ضروری ہے۔کیونکہ یہ روایات ہر معاشرے کا جزو لازم ہیں۔چاہے ان کو نبھانے کی لوگوں میں سکت ہو یا نہ ہو ان میں سے ایک مہمان نوازی ہے۔

بلوچستان میں لوگ مہمان کی خاطر جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے خود بھوکے رہ سکتے ہیں لیکن مہمان کے لیے حتی المقدور کوشش کی جاتی ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام ہو۔ایسے میں وہ خود بہت سے مسائل کا شکار ہوتے ہیں جن کا ازالہ بھوک اور افلاس کی صورت میں کرنا پڑتا ہے۔ایسی روایات جو رحمت کے بجائے زحمت کا کام کرتی ہیں مصنف اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''ہر نسل اپنے عقیدوں کے تاریک غاروں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔۔۔۔
معاشرہ روایت پسند تھا۔اجداد کی قبروں کو پکنک سپاٹ بنانے والی نسل
Static life والی روایات کو نبھانے کی کوشش کر رہی تھی روایت کے
۔۔۔۔۔وہی نسل جس کا دم بوجھ سے نکلا جا رہا تھا،مہمان نوازی کے نغمے
الاپ رہی تھی۔ان کے ہاں نظریاتی قبرستانوں میں کوئی گورکن نہ تھا،مہمان
نوازی بھی MORTUARY میں پڑی سڑتی۔۔۔'' (۴۷)

آغا گل معاشرے میں موجود دولت کی غیر مساوی تقسیم اور پست طبقے کی حمایت کے حوالے سے تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ صورتحال چند سالوں سے نہیں بلکہ صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔حکمران اپنے عوام سے

مال لوٹتے ہیں۔اور پھر مفادات کی خاطر چند ایک کو اس مال میں سے تھوڑی بہت کرم نوازی کردیتے ہیں تا کہ وہ ان کے مقاصد کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوتے رہیں۔اور ان میں موجود تاریخ دان ان کی سخاوت کے راگ الاپتے رہتے ہیں۔غریب انسانوں کا خون چوس کر پلتے ہیں۔ایک آدھ کو نواز دیا کرتے تاریخ دان ،کالم نگار چین کی بانسری بجاتے ہیں۔

شاہ جہان کس کاروبار کو چلا رہے تھے کہ ممتاز محل بنوا ڈالا۔آخر سارے حاتم طائیوں کا Source of income کیا تھی؟ کیسے کیسے مضحکہ خیز واقعات ہیں تاریخ میں دہلی کا درویش بادشاہ ناصرالدین جو ٹوپیاں سی سی کر محل کا خرچہ چلایا کرتا تھا۔کتنی لاکھ ٹوپیاں سیتا ہوگا۔آٹھ گھنٹوں میں، کیونکہ امور سلطنت کو بھی سنبھالتا تھا۔

''کورہ کئی'' میں ایک جانب تو مصنف نے روایات شکنی کے حوالے سے لکھا دوسرے جنریشن گیپ کو بھی بیان کیا ہے۔فرید کو بچپن سے ہی گھروندے بنانے کا شوق تھا۔فرید والدین کے ہمراہ رہتا تھا، وہاں مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔اس نے اصرار کر کے میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں رہنا شروع کر دیا وہاں اس کے تعلقات اپنی رجسٹرار ڈاکٹر پروین سے قائم ہو گئے۔پروین شادی کے بعد سرکاری بنگلے میں رہنا چاہتی تھی جبکہ فرید اسے اپنا گھر بنانے پر اکسا رہا تھا۔ڈاکٹر پروین نے اسے اپنی پسند کا مکان جسے سیون ٹائپ کہتے ہیں وہ دکھایا۔

سیون ٹائپ کوئٹہ کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے۔۱۹۳۵ء کے زلزلے کے بعد ایسے گھر ہی بنائے گئے ٹین کی چھتوں والے مصنف لکھتے ہیں کہ:

> ''پورا شہر چھوڑ کر وہ۔۔۔۔۔۔ٹین کی ڈھلوان چھتوں والے مکان
> کے پاس لے آئی۔۔۔۔زلزلے سے بچنے کے لیے یہ کم لاگت
> مکان اصطلاحی طور پر سیون ٹائپ مکان کہلاتے ہیں'' (۴۸)

اس صورتحال میں دونوں کا جنریشن گیپ عمر کا فرق واضح طور پر سامنے آ گیا۔پروین سیون ٹائپ مکان کو رومانٹک کہہ رہی تھی جب کہ فرید کوٹھی کے خواب دیکھ رہا تھا۔جس سے دونوں میں ان بن ہوگئی۔

افسانے میں عورت کا ایسا روپ دکھایا گیا۔ جو فرد کو اپنی مرضی سے استعمال کرنا جانتی ہے۔فرید ایک ایسا کورا کاغذ ہے جس پر کچھ بھی تحریر کیا جا سکتا ہے۔ایسا مریض جسے پہلے کبھی Antibiotic نہ دی گئی ہو۔

افسانے میں اگر کردار نگاری پر غور کیا جائے تو نسوانی کردار افسانے کا ایک مضبوط کردار ہے۔افسانے میں اس لحاظ سے موڑ اچھا آتا ہے کہ جس تیزی سے پروین اپنے خیالات بدلتی ہے اسی تیزی سے کہانی بدلتی ہے۔اس کے باوجود فرید کو اپنے خیالات بدلنے پر مجبور نہ کر سکی۔

''کورہ کئی'' میں آغا گل نے بلوچستان میں تہذیبی ترقی کے حوالے سے بھی لکھا ہے اور اپنے افسانے میں فرید کے دادا کے کردار کے ذریعے جو عقلمند اور دانا ہیں۔معاشرے اور زندگی کے تقاضوں سے باخبر ہیں ان کے زریعے پیغام دیتے ہیں کہ

''شہروں میں رہنا ضروری ہے وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جن کا

شہروں پر قبضہ ہو خصوصاً دارالحکومت پر۔۔۔۔'' (۴۹)

''دھلی'' براھوی زبان میں گھوڑے کو کہتے ہیں۔افسانہ ''دھلی'' تاریخی حوالوں کو بغیر تمہید کے بیان کرتے ہیں۔درۂ بولان میں سے گزرنے والی ریلوے لائن کی تاریخ بیان کرتا ہے۔اس حوالے سے ''معاہدہ مشکاف'' بولان ریلوے اور خان قلات کا ذکر ہے۔اس کے علاوہ پہلی افغان جنگ ۱۸۳۸ء اور ایرانی سرحد زہدان کا تاریخی حوالہ بھی ہے۔درۂ بولان سے ریلوے لائن شاید کبھی نہ گزاری جاتی۔لیکن وہ اس دور میں انگریزوں کی ضرورت تھی۔۔انہوں نے دس لاکھ پاونڈ کی خطیر رقم سے سیوی ہرنائی، بوستان، ریلوے لائن بچھا ڈالی۔آغا گل بلوچستان کے خدوخال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''لمبے لمبے سیاہ ناگ ایک بے ڈھنگی لکیر کی طرح بڑھتے گئے، سیوی

سے شاہرگ، ہرنائی، ژوب تکا ور رندلی سے آب گم، مچھ، روزان،

کولپور، کوئٹہ، چمن تک اور مغرب میں ایرانی سرحد روزان تک (جسے بعد

میں زہدان کا نام دیا گیا) ۱۸۳۸ء میں تاج برطانیہ نے سروے آڈر دیا

تھا۔۔۔۱۸۹۴ء میں ''معاہدہ مشکاف'' بولان ریلوے ہرگز نہ کرتے

۔۔۔۔۔۔۔۔'' (۵۰)

بلوچستان کے موسم اور ان سے ہونے والی تباہیوں جن میں ریلوے ٹریکٹر کے تاریخ میں یہاں اکڑنے کے حوالے سے بے شمار واقعات ہیں۔ جو افسانہ نگار سنین کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ دریائے بولان کی خشک گزر گاہوں میں ہولناک طوفان آیا کرتے ہیں۔ یہ چھوٹی سی آب جو اچانک بپھر جاتی ہے۔ ہرک ریلوے اسٹیشن کے پاس ۱۸۸۹ء میں اس نے میلوں طویل ریلوے لائن کو تنکے کی طرح اچھال پھینکا تھا۔ اور پھر ۱۸۹۰ء میں بولان ریلوے کو حقارت سے خس و خاشاک کی مانند چٹانوں سے دے مارا تھا۔

''ھلی'' کا مرکزی کردار نبو بلوچستان کا ایک عام سا کردار ہے۔ جو اپنی روایات اور ثقافت میں جینا چاہتا ہے۔ اسے اپنی چچا زاد کزن سے محبت ہوتی ہے۔ ایک گھر میں رہنے کے باوجود ایکدوسرے سے اجنبی بن کر رہنے پر مجبور تھے۔ بلوچستان میں خواتین کے پردے کا خاص التزام ہے۔ یہ ان کے رسم و رواج میں شامل ہے:

''کزن بھی جوان ہو کر دور رہنے پر مجبور تھے، رسموں میں بندھے
ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ان کے درمیان فاصلے کا التزام
رہتا، لیکن ان دو کناروں کے بیچ محبت کا دریا بہتا، غیر محسوس خاموش
پُر وقار۔۔۔۔'' (۵۱)

بلوچستان میں لوگ اپنی روایات پر سختی سے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ مشکل گھڑی میں اپنا دیکھتے ہیں نہ پرایا مدد کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔

افسانہ ''ھلی'' میں مصنف نے جس طرح برصغیر میں انگریزوں کی آمد کا ذکر کیا ہے۔ ان کی حکمرانی آزادی پسند لوگوں کے لیے اذیت سے کم نہ تھی لیکن اس کے باوجود نبو ایک روایت پسند شخص تھا، روایات کی پاسداری کرنے کی وجہ سے ایک انگریز کی جان بچانے پہنچ جاتا ہے۔ اور شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ انگریزوں کا ان کی سرزمین پر آنا اگرچہ ناپسند تھا لیکن اس نفرت کو وہ اپنی روایات کی پاسداری کی خاطر بھلا کے مدد کرتا ہے۔

اس افسانے میں بلوچستان میں پائی جانے والی معاشی پسماندگی کے بارے میں کافی مواد موجود ہے۔ اور معاشرے کے

اعلیٰ طبقے پر طنز ہے کہ کس طرح کوئلہ کمپنی میں دھماکہ ہوا اور کان بیٹھ گئی۔ ہزاروں جانوں کا ضیائع ہوا جس میں نبو کے والد اور چچا بھی شامل تھے۔اور ان کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان لوگوں کو کیسے معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً سوگ منانا بھی لازم و ملزوم رسم تسلیم کی جاتی ہے معاشرے میں جسے غریب برداشت نہیں کر سکتے۔اور کوئلہ کمپنی کی پنشن کی رقم اس قدر قلیل کہ مٹی کا تیل تک نہ خریدا جا سکے۔

افسانہ ''ھلی'' میں آغا گل نے معاشرتی مسائل اور ان کا سبب انگریزوں کی برصغیر آمد کے حوالے سے بھی قلم اٹھایا۔ کیسے معاشرتی اقدار کی پامالی کی جاتی رہی، غیر حقیقی معاشرے میں رشتوں کا احترام جاتا رہا کیونکہ جو شئے کاروبار بنے وہ روح کھو بیٹھتی ہے۔

افسانہ ''ھلی'' میں مصنف نے بلوچستان میں تہذیبی ترقی کی بھی عکاسی کی ہے۔بلوچستان میں پائے جانے والے معدنی ذخائر جو وافر مقدار میں موجود ہیں۔ان سے مستفید ہونے کے حوالے سے افسانہ نگار نے بلوچستان میں آج بھی جو بے چینی اور بدامنی کی کیفیت ہے وہ بیرونی طاقتوں کا عمل دخل ہے۔معدنی ذخائر غیروں کی نظر میں حرص کی آگ دہکائے رکھتے ہیں۔ برصغیر کے لوگوں کا اس جانب کوچ کرنا بھی اس افسانے میں بتایا گیا ہے۔ جب پورے برصغیر سے لوگ مچ کا کوئلہ حاصل کرنے کے لیے بلوچستان کی جانب دوڑے چلے آئے تھے۔مچ نام کے حوالے سے آغا گل افسانے میں ہی ایک مقام پر وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''مچ کھجور کے درخت کو کہتے ہیں اور اسی نخلستان کی نسبت سے اسے
یہ نام دیا گیا'' (۵۲)

آغا گل کے افسانے دراصل بلوچستان کی عکاسی کا دوسرا نام ہیں۔کم و بیش تمام افسانے ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے بجائے ادب برائے بلوچستان کے عکاس محسوس ہوتے ہیں۔ان کے ہاں مقامی رنگ کے علاوہ دیگر رنگ بھی دکھائی دیتا ہے مگر افسانوی مجموعہ ''گورپج'' بلوچستان کا ایک بھرپور عکس نظر آتا ہے۔اس حوالے سے معروف نقاد اور ادیب ڈاکٹر حیدر کا سنگجوی اپنی کتاب ''ادبی ورثہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''آغا گل نے بلوچستان کی سماجی زندگی کو اپنے اکثر افسانوں کا

موضوع بنایا ہے'' (۵۳)

آغا گل نے اپنے اس افسانے میں تاریخی واقعات ،معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔مثلاً بنو سوچتا اس کے خواب کب پورے ہوں گے۔وہ بے جان ریلوے لائن کے ساتھ اپنی دھن میں چلتا جاتا کندھے پر آہنی اسپنسر اٹھائے ،غموں کا بوجھ اٹھائے کوئی راز دان ،ہمدم کوئی بزرگ بھی نہ تھا جس سے وہ اپنا غم بانٹتا۔ایسے میں اس کا اسپنسر ہی اس کا مونس وغمخوار تھا، جب وہ ''ھلی'' چلاتا تو یہی سوچتا رہتا کہ شاید زباد کے گھر بھی ھلی کی آواز جاتی ہو وہ اس آواز کو پہچانتی تھی بچپن میں وہ اور زباد جب اکٹھے بکریاں چراتے تھے تب وہ دونوں ھلی کی آواز سن کر شور مچاتے ،خوش ہوتے ،اس سوچ کے ساتھ ہی بنو کا ھلی جی اٹھتا اس کا انگ انگ بولنے لگتا۔جب سیکنڈ ڈرائیور ھلی لے کر جاتا تو بنو بے چینی سے اس کا انتظار کرتا تھا۔اپنے دوست ،اپنے ہمدرد کا۔

افسانہ ''ھلی'' آغا گل کا ایک شاندار افسانہ ہے۔جو انسانی نفسیات معاشرتی مسائل اور بلوچستان کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ھلی پڑھ کر معلوم ہوتا ہے مصنف کا ریلوے خصوصاً بلوچستان ریلوے سے خاصا گہرا تعلق رہا ہے۔وہ کہتے ہیں

''جب افسانہ ''ھلی'' میں نے لکھنا تھا تو میں خود ریلوے ٹریک پر

جایا کرتا تھا۔اسپنسر دیکھتا اور اس کو اٹھاتا تھا'' (۵۴)

مصنف کا ریلوے کے بارے میں علم اس اقتباس سے عیاں ہو جاتا ہے جہاں ریل کی بات کرتے ہیں۔اپنے مشاہدے اور تجربے سے اپنے موضوع میں جان ڈال دیتے ہیں

''پڑی بھی یہاں سر پاؤنڈ کی ڈالی گئی تھی جس کے ایک ٹکڑے کے

نیچے لکڑی کے تیرہ سلیپر ضروری تھے۔بریک کا ویکیوم ۲۴ انچ رکھنا پڑتا

اور انجنوں اسٹیم پریشر ایک سو سے ایک سو اسی تک ہونا ضروری ہے'' (۵۵)

افسانے میں ایک غم کی فضا ہے خواہ نبو (کردار) اپنے مقاصد میں کامیاب ہو رہا ہے مگر والد کی وفات سے اس کی خودکشی تک جو ایک فضا ہے وہ مسلسل غمگین ہے۔ اور ایسے میں لکھے گئے افسانے کا قاری پر اثر بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

افسانے کا عنوان براہوی زبان کا لفظ ہے۔ اس میں زباد، خوردہ، دانکہ دنیا آئیں شرمریہ گوبراں سئیں، ایل دھند، براہوی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ جن کے مطلب بریکٹ یا پھر حاشیے میں لکھ دیئے گئے ہیں جو مضمون کو بالکل مقامی بناتے ہیں اور براہوی ماحول پیدا کرتے ہیں۔

اس افسانے ''دھلی'' میں ایک انقلابی سوچ بھی عیاں ہے۔ جو نبو (غلام نبی) کی شاہ میر سے ہونے والی گفتگو سے عیاں ہے۔ تقسیم برصغیر اپنے ساتھ ہزاروں خونچکاں کہانیاں لے آئی۔ گھر لٹے، وطن چھوٹے، عصمتیں تاراج ہوئیں۔ ہزاروں بے قصور انسان خون کی ندیوں میں نہا گئے۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے انسانی مصائب پر بے پناہ لکھا۔ ہر طرف ظلم کے اوراق بکھرے ہوئے تھے۔ اور ہمارے دانشوران اوراق کو چنتے چنتے تھک گئے۔ پھر ایک وقت آیا زخم بھرنے لگے اور دل بے قرار کو قرار سا آ گیا۔ قتل و غارت کے واقعات کو چھوڑ کر ادیب نئے موضوعات کی طرف مائل ہو گئے۔ آج کوئی بھی افسانہ نگار تقسیم کے حوالے سے نہیں لکھ رہا۔ لیکن آغا گل کے زخم آج بھی تازہ ہیں۔ آغا گل کے افسانہ ''روپے کے جن'' کے حوالے سے قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں کہ

> ''مجھے آغا گل کے افسانے بہت پسند ہیں کیونکہ بلوچستان نے مجھے ہمیشہ Fasicinate کیا ہے۔ میں کوئٹہ میں چند ایام گزار چکی ہوں۔ بلوچستان کے متعلق بہت کم لکھا گیا، فکشن تو بالکل بھی نہیں۔ آغا گل کے افسانوں میں Humanitrainasm کی جو لہریں ہیں۔۔۔ آج یہ صنف ہمارے ادب میں مفقود ہوتی جارہی ہے۔۔۔ ۔۔۔ بہر حال ان کے افسانوں میں ''روپے کا جن'' سب سے زیادہ پسند ہے''۔ (۵۶)

یہ افسانہ جب لکھا گیا تو اس کا نام ''خدا تبدیل کر لیتے'' تھا۔مگر بعد میں اس کا نام بدل کر ''روپے کا جن'' رکھ دیا گیا۔افسانے کو پہلے عنوان ''خدا تبدیل کر لیتے'' سے پاکستان کے مختلف رسالوں میں چھپنے کے لیے بھجوایا گیا۔مگر شاید اس افسانے کا نام کسی کو بھی پسند نہ آیا اس لیے کسی بھی پاکستانی رسالے یا شمارے میں نہ چھپ سکا۔جب اس کا عنوان تبدیل کر کے ''روپے کا جن'' رکھ دیا اور پھر چھپنے کے لیے بھیجا گیا تو نئے نام کے ساتھ بہت سے رسالوں میں چھپ گیا جہاں پہلے نہیں چھپا تھا۔''روپے کا جن'' ماہنامہ منشور کراچی میں نومبر ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔

یہ ایسا افسانہ ہے جو کہ مصنف کے ذاتی مشاہدے کا عکس لیے ہوئے ہے۔انہوں نے اپنے اس افسانے میں علاقائی تعصب یا لسانی عصبیت کا مظاہرہ کیے بغیر بھارت سے ہجرت کر کے آنے والوں کے مسائل کو کھول کر بیان کیا ہے۔آغا گل بلوچستان پہنچنے والے مسلمانوں کی Characterzation کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ اپنا درد بھرا دل کاغذ پر نکال کر رکھ دیا ہو۔آغا گل کا افسانہ ''روپے کا جن'' کچھ ایسی ہی صورت رکھتا ہے۔

آغا گل اس حوالے سے افسانے میں غیر مقامی لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ معاشرے میں جو پسا ہوا طبقہ ہے، مثلاً بھارت سے لٹ پٹ کر آنے والوں کے پاس تن ڈھانپنے اور کھانے کو کچھ نہ تھا۔اکثر بچے پاؤں میں بغیر چپلوں کے گھومتے پھرتے، پیوند لگے کپڑے پہنتے جو کہ عام رواج تھا۔ٹین کے تباہ حال مکانوں میں کئی کئی خاندان ایک ساتھ اکٹھے رہتے۔آغا گل نے اپنے افسانے میں غیر مقامی لوگوں کی صورتحال کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کا تلخ رویہ بھی بیان کیا ہے۔لوکل اور نان لوکل کا فرق دکھایا۔افسانہ نگار اس حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ

> ''قبائلی ذہن تربور (کزن) کو بھی قبول نہ کرتا، کجا لٹے پٹے لوگوں
> کا جم غفیر ------ وہ نفرت اور خوف کی نگاہ سے دیکھتے اور پناہ
> گزین کو ------ ''پناہ گوز'' کہتے ---'' (۵۸)

اس اقتباس میں تربور (کزن) کے حوالے سے جو بات کی گئی ہے۔وہ اس سے قبل ''دوسری بابری مسجد'' میں آغا گل نے بیان کیا ہے۔اس افسانے میں مصنف نے بلوچستان کی ایسی حالت بیان کی ہے جس میں قیامِ پاکستان کے بعد آنے

والے مہاجرین کا دکھ پوشیدہ ہے۔ مصنف افسانے میں کوئٹہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''کوئٹہ بدستور لٹل لندن کہلاتا تھا یہ نام انگریزوں نے دیا تھا بعد
میں مقامی حکومت کے ہاتھ آیا تو بگ ویلج کہلانے لگا'' (۵۹)

''روپے کا جن'' میں آغا گل نے ایک مہاجر خاندان کی کہانی میں ایک پیار کی داستان بیان کی ہے۔ جن بابا جو کہ پورے شہر میں اسی نام سے مشہور تھا۔ لوگ اس کے پاس تعویز اور دعا کروانے آیا کرتے تھے۔ اس جن بابا کو ایک لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ اور لڑکی بھی اس سے شدید محبت کرتی ہے۔ مگر لڑکی کے والدین نے ولور کی زیادہ رقم وصول کرنے کے بعد اس کی شادی کہیں اور طے کردی۔ جس کی وجہ سے جن بابا نے زہر کھالیا اور لڑکی نے شادی والے دن خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی۔
اس افسانے کی کہانی تو سادہ سی ہے اور کہانی عام طور پر قاری کو پڑھنے کے لیے مل جاتی ہے۔ مگر اس کی بنت کمال کی ہے۔ خاص طور پر جو انداز مصنف نے ''روپے کا جن'' میں اپنایا ہے۔ وہ بالکل نیا اور جاندار ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس عشقیہ داستان کو براہ راست بیان کرنے کے بجائے مہاجر خاندان کی جانب سے بیان کیا ہے۔
اس کہانی میں جہاں مقامی لوگوں کا مرثیہ تحریر کیا گیا ہے۔ وہاں مقامی لوگوں کا نوحہ بھی ہے۔ جس میں ولور جیسی رسم کا ذکر ہے۔ جس کی وجہ سے جن بابا خودکشی پر مجبور ہوا تھا۔ ولور بلوچستان میں ایک ضروری رسم ہے جو شادی بیاہ کے موقع پر ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم میں لڑکی کے والدین لڑکے والوں سے من پسند ولور طلب کرتے ہیں۔ لڑکی والوں کو لڑکے والوں سے ولور کی مطلوبہ رقم جس رشتے سے مل رہی ہو وہاں وہ لڑکی کا رشتہ طے کر دیتے ہیں۔ آغا گل نے اس رسم کے ثمرات بیان کیے ہیں۔ کہ کس طرح اس بے رحم رسم کی بدولت ایک پیار کرنے والا جوڑا موت کی آغوش میں چلا گیا۔

آغا گل اپنے افسانوں میں بلوچی تہذیب وثقافت کی لفظی تصویریں بناتے چلے جاتے ہیں اور یہی ان کا بنیادی نکتہ ہے۔ اس میں انہوں نے مقامی لوگوں کا طرز احساس بتایا ہے۔ بلوچستان میں لوگ اپنی روایات کو دل وجان سے قبول کرتے ہیں۔ مثلاً اس افسانے میں مصنف نے ایک چھوٹے بچے ''عمو'' کے زبانی بیان کیا ہے، جب جن بابا کی محبوبہ عمو کو جن بابا کے لیے خط دیتی ہے تو ساتھ میں روپیہ بھی دیتی ہے میرے بھائی یہ تمہارا انعام۔ یہ سن کر وہ روپیہ عمو کے

ہاتھ میں ایک نا قابلِ برداشت بوجھ بن جاتا ہے اور چھن سے زمین پر گر جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں بھائی بہنوں کا سہارا بنتے ہیں، بہنوں کو دیا کرتے ہیں اور لیتے کچھ نہیں۔

افسانے میں مقامی لوگوں کے رکھ رکھاؤ کے حوالے سے بھی بات کی گئی ہے کہ مقامی لوگ خاصے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ مقامی لوگوں میں رکھ رکھاؤ، آداب نشست و برخاست اور مہمان نوازی مہاجرین سے بڑھ کے تھی۔ مقامیوں نے خندہ پیشانی سے غیر مقامی لوگوں کا استقبال کیا۔ حالانکہ وہ بن بلائے چلے آئے تھے، پہننے اوڑھنے، کھانے پینے کو کچھ نہ تھا۔ اس کے علاوہ مقامی الفاظ کا استعمال بھی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ جیسے چھنگلی، مشہدی، رومال، بالشت وغیرہ۔ آغا گل کا یہ افسانہ ''روپے کا جن'' اس قابل ہے کہ اس کو ایک اچھی تخلیقی کاوش قرار دیا جا سکتا ہے۔

''چیمر'' جس کا مطلب براہوی میں 'کانٹے' کے ہے۔ افسانے میں آغا گل نے اس کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اور پھر خود ہی اس علامت کو کھول کر بیان کر دیا۔ اور اس کے معنی و مفہوم کو واضع کر دیا ہے۔

آغا گل نے افسانہ ''چیمر'' میں فلسفیانہ نظریات کی عکاسی بھی کی ہے۔ مثلاً وہ چیمر کے معنی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ براہوی زبان میں سفید رنگ کے گول کانٹے کو کہتے ہیں جس کی ہر سمت نوکیں ہی نوکیں ہوا کرتی ہیں۔ جیسے یہ دنیا ایک جلتا ہوا صحرا ہے۔ جہاں جینا بہت دشوار اور مرنا بہت آسان ہے۔ اس صحرا میں تین قسم کے کانٹے پائے جاتے ہیں مثلاً بادشاہ، جنرل، پروہت انسانیت انہوں نے زندگی تار تار کر رکھی ہے۔ جو چیز بھی ان سے الجھی وہ اپنا وجود کھو بیٹھی۔

''چیمر'' میں آغا گل نے تاریخی حوالوں سے افسانے کو پُر معنی بنانے کی کوشش کی ہے۔ جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ جب افغان، روس جنگ شروع ہوئی اچانک فضا راکٹوں کے فائر سے کانپ اٹھی۔ روسی ٹینک آگ اگلتے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ہر شئے کو روندتے ہوئے، مجاہدین راکٹوں کے ٹینکوں پر فائر کرنے لگے۔ آغا گل نے افسانے میں ایک مقام پر جنگ کے نتائج کے حوالے سے لکھا کہ

''امریکہ کا دنیا میں کوئی حریف نہ بچے گا، وہ روایتی دجال کی طرح

دندناتا دنیا بھر میں پھرے گا۔ آخر اپنی موت آپ مرجائے گا" (۶۰)

آغا گل نے اس افسانے میں مقامی پن سے نکل کر قومی اور بین الاقوامی سیاست کا رخ بھی واضح کیا ہے۔ مگر یہ بھی اس خطے کی نمائندگی کرتا ہے، جس سے وہ تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے صوبہ سرحد کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر بڑی وضاحت اور دلالت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس صوبہ کا نام سرحد نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسی بات ہے تو فرانس کا نام بھی سرحد رکھ دینا چاہیے جس کے ساتھ بہت سے ملکوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اور برطانیہ پورا بذات خود ایک سرحد ہے۔

افسانہ "جبر" میں مصنف نے تربت والوں کا انداز تخاطب اور رویہ جو انکا غیر مقامی افراد سے ہے اسے بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"یہاں پہاڑ بھی سیاہ تھے، ریت بھی سیاہ، دلوں کا حال تو خیر خدا ہی
جانتا ہے۔ باسی بھی اسی رنگ روپ کے نہایت نخوت سے مجھ جیسوں
کوڈنی مردم (غیر مقامی) کہہ کر پکارتے، اب درگذر کے سوا چارہ ہی
کیا تھا۔ جہالت اور تعصب کا چولی دامن کا ساتھ ہے" (۶۲)

افسانے کا انداز مقامی رنگ کا ہے۔ وہ قبائیلوں کو ہر صورت میں برتر دکھاتے ہیں۔ خواہ وہ افغان ہی کیوں نہ ہوں۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ

"شاہ ولی ترہ کئی قوم سے تھا۔ دبلا پتلا دراز قد آنکھوں میں ذہانت
کی چمک، ارادوں کی مضبوطی نظر آتی۔ کمزور جسموں میں طاقت ور
انسان دکھائی دیتے ہیں۔۔۔۔نہایت عالم فاضل شخص تھا۔۔۔۔
افغانستان میں جنگ شروع ہوئی تو۔۔۔۔ایک جری قوم آپس میں نبرد
کا بے مثل مظاہرہ دیکھ کر کمانڈر عش عش کر اٹھا" (۶۳)

آغا گل کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں مقامی رنگوں سے مختلف جاذب توجہ تصویریں بڑی مہارت سے بناتے اور دکھاتے ہیں۔ اس افسانے "جبر" میں مقامی رنگ ان کے فن پر حاوی دکھائی دیتا ہے۔

اس افسانے کا کلائمکس زیادہ زوردار تو نہیں مگر قابلِ تعجب ضرور ہے۔اس کے علاوہ آغا گل نے اپنے افسانے میں براہوی زبان کے بہت سے الفاظ اور بلوچی کہاوتیں بھی تحریر کی ہیں مثلاً چبر، پوپٹ، پلچی پو، الیوگ، لیکن جو لوگ براہوی نہیں جانتے وہ ان کا مفہوم کیا جانیں گے۔بلوچی محاوروں میں ''سانگ بندی لانگ بندی'' (لاغر کی خاطر جنگ لازم ہے)، ''ہر چہ باد آباد'' (جان تو آنی جانی ہے)، وفا پر مٹنے والوں کے تو محاورے بھی منفرد ہیں، ''لٹھے اہلم کن خلس۔ایت خدا کن کرک''، (لٹھ بھائی کے لیے چلاؤ، بات چاہے خدالگتی کہو)۔اس افسانے میں آغا گل کا بیانیہ اندازِ تحریر کھل کر سامنے آتا ہے۔

معاشرے میں موجود برائیوں کا ادراک کرنا اور کرانا بھی ادیب کا کام ہوا کرتا ہے۔مگر بہت کم ہوتا ہے کہ ادیب اسکا حل بھی پیش کرے۔افسانہ ''دھوپ کی چادر'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں مصنف نے معاشرے کی موجودہ حالت پر طنز بھی کی گئی ہے۔اور ایک ایسے حساس طبقے کے حوالے سے لکھا ہے۔جس کے بارے میں ہمیشہ ہی بہت کم لکھا گیا ہے۔شعبہ صحافت کے حوالے سے اگر لکھا بھی گیا تو بہت کم مگر جس بے باکانہ انداز میں ''دھوپ کی چادر'' میں شعبہ صحافت پر طنز کی گئی ہے۔اس کا جواب نہیں۔اس پاکیزہ شعبے سے وابستہ ایسے افراد جنکے باعث اب تک یہ شعبہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کالم نویسی پلاسٹک کے لوٹے یا قلفیاں بنانے کی طرح میکانکی عمل ہے۔بنے بنائے سانچوں میں مال ڈالا۔کھٹا کھٹ چیز تیار، ویسے بھی پیٹ بھرا تو انا انسان جانے کیا کیا الم غلم لے بیٹھتا ہے۔اپنی کمزوریوں سے تو سبھی خائف رہتے ہیں، تحفے تحائف کے نام پہ جو رشوت خوری، بھتہ خوری اس شعبے میں موجود گمراہ لوگ خوشامدانہ کالم لکھ کر لیتے ہیں۔مصنف نے اس پہلو پر بھی نظرِ تاسف ڈالی ہے۔

''دھوپ کی چادر'' ایک ایسا افسانہ ہے، جس میں مصنف نے بلوچستان کی سیاسی صورتحال کے حوالے سے بھی لکھا ہے۔انہوں نے اس موقع پر ایک شعر بھی ٹانک دیا ہے۔

شیطان ایک رات میں انسان بن گئے

جتنے نمک حرام تھے شیطان بن گئے

افسانے کی کہانی ایک نئے انداز کی کہانی ہے۔جس میں کہانی کا ہیرو حالات سے بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔جو اس کی خواہش ہوتی ہے وہی کرتا ہے۔اس معاشرتی بندھن کو کسی بھی انداز میں نہیں روکتے یہی اس کہانی کا ایک خلاء ہے۔جب اسے ایک دوست کی بابت ٹینا کی اصلیت معلوم ہوتی ہے۔تو وہ سنتے ہی سیخ پا ہو جاتا ہے۔

مصنف نے عورتوں کی خرید وفروخت کے حوالے سے اپنے نظریات کی عکاسی کی ہے۔جب ساگر ٹینا کو طعنہ دیتا ہے تو اسے کمزور صحافت کا طعنہ دیتی ہے۔اسے کہتی ہے خود کو زیادہ پاک باز مت سمجھو۔اٹھا پھینکو ان نظریات کو جو تمہیں وراثت میں ملے ہیں۔

زبان کی ساری اصطلاحات عورتوں کے لیے ہیں عورت کو گائے بکری کی طرح بیچا گیا۔ایک مرد جو بیک وقت کئی عورتوں سے تعلق رکھے اسے کیا کہتے ہیں؟ دانشوروں نے بھی تو یہی کیا، ہزاروں برس کی تاریخ سے اس دانشور، انسان دوست مفکر کا نام بتاؤ جس نے عورتوں کی خرید وفروخت کو روکا ہو۔

کہانی کا آغاز بڑے جذباتی انداز میں کیا گیا ہے۔مگر درمیان میں وہ جذباتی انداز دھیما پڑ جاتا ہے۔لیکن کہانی کے اختتام پر ایک مرتبہ پھر جذباتی انداز میں سامنے آتا ہے۔ساگر جب ٹینا کی گفتگو میں سچائی کا عنصر دیکھتا ہے تو وہ یہ سب معاشرتی بندھن، اپنے والدین، نوکری، احباب کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

''دھوپ کی چادر'' میں ایسا معلوم ہوتا ہے مصنف نے بڑے اہتمام سے کہانی بنی اور اس کو سینت سنبھال کر بڑھتے چلے گئے۔اس افسانے میں انسانی نفسیات کی عکاسی بھی بہت عمدہ انداز میں کی گئی ہے۔مثلاً ''کیسا بے ثمر مشغلہ ہے، اپنے آپ سے لڑنا بھی''۔''تارک الدنیا راہبوں کی طرح غاروں میں بند، عمر بھر اپنے ہی نفس سے یک طرفہ لڑائی لڑتے، وہ آخر کار مر جاتے ہار یا جیت کا اعلان کیے بغیر''۔''دھوپ کی چادر'' ایک جدید معاشرے کی کہانی ہے خاص طور پر اگر بلوچستان کے تناظر میں لیا جائے تو یہ مزید اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔اور یہی اس افسانے کی خوبی ہے مگر اس افسانے میں انہوں نے

نسوانی کرداروں کو دیگر افسانوں کی نسبت کھلے انداز میں پیش کیا ہے۔

۱۹۷۳ء میں بلوچستان کی منتخب حکومت کو ختم کر کے جب بلوچستان میں آپریشن کیا گیا۔ اس وقت بلوچستان میں نوجوانوں نے ایک تحریک کا آغاز کیا۔ جب بلوچستان کا نام ''کوئٹہ ڈویژن'' رکھ دیا گیا تھا۔ اسی سانحے اور تحریک کے تناظر میں ''گوریچ''، تحریر کیا گیا ہے۔ جب بلوچستان میں بہت سے لوگ بغاوت پر اتر آئے تو انہوں نے ہتھیار اٹھائے۔ اسے مصنف نے حقوق کی جنگ کا نام دیا، اس حوالے سے تحریر کیا مگر اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ اس میں لوگوں کو اشتعال دلایا گیا ان کو بے جا استعمال بھی کیا گیا۔ اور حقوق کی یہ جنگ ایک بے نتیجہ موڑ پر آ کر ختم ہو چکی تھی۔ یہ گویلا جنگ محض اس لیے شروع ہوئی کہ چند لوگوں کو اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔

''گوریچ'' خالصتاً بلوچستان کے تناظر میں لکھی گئی کہانی ہے۔ جس میں ۱۹۷۳ء کے بعد کے حالات کے باعث بہت سے گھرانے تباہ ہوئے، بے شمار نوجوان جیلوں میں سڑنے لگے۔ وہ پہاڑوں میں چھپ گئے مصنف رقم طراز ہیں کہ:

''جن سالوں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اکثریت جیل خانوں، ہسپتالوں یا پہاڑوں میں سخت کوش تھی۔ سرداروں، نوابوں کے بیٹے۔۔۔۔۔ غیر ممالک میں زیر تعلیم تھے۔ حقوق یافتہ طبقہ برسر اقتدار تھا۔۔۔۔ اس استحصالی طبقے نے نوجوانوں کو استعمال کرنے کے بعد معاشرے کی گود میں حقارت سے اچھال پھینکا تھا۔ جیسے خالی ماچس، جیسے سگریٹ کا ٹوٹا۔۔۔'' (۶۴)

آغا گل نے مقامی استحصالی قوتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس میں سیاست کا منبع الٰہی انہی لوگوں کو ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''کل کلاں روس کا قبضہ ہوتا تو راتوں رات نام بدل کر خان سے

خانانوف بن جاتے'' (۶۵)

اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے انہی دو غلے سیاستدانوں کے حوالے سے ایک شعر بھی لکھا:

''تم حال میرے دل کیا پوچھتی ہو منی

شیعوں کے ساتھ شیعہ، سنی کے ساتھ سنی

مصنف نے اس افسانے میں بلوچستان میں علمی وادبی سطح پر ہونے والی تہذیبی ترقی کے بھی حوالے دیئے ہیں جیسے

''مولانا دین محمد پندرانی کا ۱۹۱۴ء والانسخہ۔۔۔جو براہوی زبان

میں کلام اللہ کا اولین ترجمہ ہے۔' (۶۶)

ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ

''مستونگ ہائی سکول ۱۹۳۵ء میں قائم ہوا یہ بلوچستان کا اولین ترین

ہائی اسکولوں میں سے ایک تھا'' (۶۷)

افسانہ ''گوریچ'' میں علاقائی رسم ورواج، زبان، بودوباش کا ذکر بھی ہے۔ مصنف جب علاقائی ثقافت کو بیان کرتے ہیں، وہیں ان کے ہاں جدید دور کی ستم ظریفی بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ان کا احساس زیاں ہے ملال مگر ان کا دل دہائی دیتا ہے کہ وہ روایت سے کٹنا نہیں چاہتے۔ مگر جب کوئی رسم ورواج پسند نہ آئے تو اس کی خبر بھی خوب لیتے ہیں۔ اور اپنے خیالات کا بے دریغ اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً براہوی کلچر کتنا پاکیزہ اور PURE تھا، لیکن اب غلیظ شہروں میں مجبوری کے تحت رہنا پڑ رہا ہے۔ کیونکہ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ سماجی برائیوں کا حوالہ بھی اس افسانے میں ملتا ہے۔ جن میں رشوت کا ذکر کثرت سے نظر آتا ہے۔ مصنف کے نزدیک رشوت کا روپیہ بے جڑ درخت کی مانند تیزی سے پھلتا پھولتا ہے۔ پرانے بادشاہ تلوار کی نوک پر رشوت لیا کرتے تھے، اب محبت سے لی جاتی ہے۔

''گوریچ'' آغا گل کا شاہکار افسانہ ہے۔ جس کو اگر بلوچستان کے تناظر میں بطور ریفرنس پیش کیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے گوریچ میں ہواؤں کے مختلف ناموں کو بیان کیا ہے۔ جس میں گوریچ کے علاوہ

سرگوات (پروائی)، ہمی (نسیمِ بحری)، زحسیاری، (روز مرہ چلنے اولی ہوا)، ناشی (سمندری تیز ہوا گوش (خوشگوار ہوا)، اپرت گوات (سرد مغربی ہوا)، اورتوز (ہوا جس سے بگولہ اٹھتا ہے) اہم ہیں۔ اس کے علاوہ ساروان، جھاولان، کلی مینگل رود بیکن تی، خلی، تیری، درینگو، مستونگ، کوہ چلتن اور لک پاس جیسے بلوچستان کے مختلف علاقوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔"

گورپچ'' کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف نے قرآنی حوالوں سے بھی مدد لی ہے اور بائبل سے بھی استفادہ کیا ہے۔ کیونکہ آغا گل نے افسانہ ہواؤں کے حوالے سے لکھا ہے۔ اس لیے قرآن مجید سے بھی حوالے انہوں نے لیے ہیں۔ ''قوم عاد' پر چلائی جانے والی نامبارک ہوا اور ''قوم لوط'' پر چلنے والی کنکریوں بھری ہوا کے متعلق بھی لکھتے ہیں۔ دیگر قرآنی حوالوں میں آیات کا ترجمہ من وعن بیان کر رہے ہیں۔ جس کی وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جس میں سورۂ آل عمران اور سورۂ حم، السجدہ، کی آیات شامل ہیں۔ بائبل کے حوالوں میں ملکا (وہ مقام جہاں حضرت یسوع کو مصلوب کیا گیا تھا اس کا ذکر اور اس کے ساتھ ساتھ شمعون اور روفس کی بات کرتے ہیں۔ ''گورپچ'' یقیناً آغا گل کا ایک عظیم افسانہ ہے۔ جو کہ جدید افسانے کی روایت سے بہت قریب ہے۔

پرتھوی غوری:

آغا گل کا چھٹا افسانوی مجموعہ ''پرتھوی غوری'' ہے۔ جسے اس سے قبل وہ ''آکاش ساگر'' کے نام سے شائع کروا چکے ہیں۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعے میں تمام افسانے وہی ہیں جو ''آکاش ساگر'' میں منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اس افسانوی مجموعے کو رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی نے مارچ ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔ اس افسانوی مجموعے کو رنگِ ادب پبلی کیشنز نے، کراچی مارچ ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔ اس افسانوی مجموعہ کا پیش لفظ مصنف کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ ''پرتھوی غوری'' کا پہلا افسانہ ''دوسری بابری مسجد'' ہے۔ جو اس سے قبل ''گورپچ'' میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا افسانہ ''اندھادن'' ہے۔ یہ افسانہ آغا گل کی بہترین کاوش ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے ایک انگریزی قول بھی قلمبند کیا ہے۔ Hell is others یہ اپنی جگہ غلط نہیں لیکن اس سے مراد سارتر کا قول ہے تو اسے پھر اس طرح ہونا چاہیے۔ The other is hell اس افسانے میں The other سے مراد انسانوں کا وہ ہجوم ہے، جو رزق کی تلاش میں بڑے شہروں کا اندھا دھند رخ کیے ہوئے ہیں۔ کیونکہ شہروں میں رزق کمانے کے کثیر تعداد میں مواقع موجود ہوتے ہیں۔ اسی لیے لوگ جوق در جوق شہروں میں رہنے لگے۔ The other اگر ایک ہو تب بھی hell ہوتا ہے۔ اور جب ہجوم ہو تو کیا حال ہو گا۔ دیہاتی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''شہر سے دور بلندیوں پر پہاڑی سلسلوں کے اندر گھنے درختوں سے
> گھرا سویا سویا سا، بہت اچھا اچھا سا گاؤں اسے اکثر یاد آیا کرتا تھا۔
> جہاں کہیں حسن ہے، سکون ہے، آرام ہے۔۔۔'' (۶۸)

دیہات میں معیشت کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو روزگار کے مواقع ناپید ہیں۔ کھانے کو کچھ نہیں ملتا، حسن کشمیر نہ ہوتا روٹیاں ہوتیں۔ گاؤں میں چرند پرند نہ ہوتے، گنگناتے چشمے، ہواؤں میں اڑتی خوشیاں مناتی تتلیاں نہ ہوتیں مگر روزگار ہوتا۔ صرف سکون اور خوبصورتی سے پیٹ نہیں بھرتا۔ دیہی زندگی کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کی صورتحال کو بھی اس افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔ شہروں میں رہنا مشکل ہے، وہاں دھوئیں اور

بدبو سے اٹے بازار ہیں۔ایسا ماحول جان لیوا ہے۔ ماحول خوشگوار ہے، لیکن شہروں میں روزگار ہے۔ روزگار ہے بھی تو کہاں؟ گلیمر میں، جنگوں میں، وردیوں میں نشہ آور اشیاء میں، کمر سے پیٹی باندھنے میں "Hell is other" انسان ہی انسان مصنف کا ایک قول ہی ثابت کر دیتا ہے کہ وہ احساس کے کس عذاب میں جی رہے ہیں۔ اس قسم کا بے سمت ہجوم لازماً توہم پرست بھی ہو جاتا ہے۔

گاؤں کے مکین اپنے تحفظ کا منبع ایک مزار "چوب بی بی" کا ہے۔ اسی کو اپنے تحفظ کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ عورتیں، بچے اور مرد جوق در جوق چوب بی بی کے مزار پر حاضری دینے جایا کرتے۔ اپنے گناہ بخشواتے، منتیں مانگتے، مراد جب بر آتی تو نیازیں بھی چڑھاتے۔

لوگ خدا کی ذات کے بجائے سارا کریڈٹ چوب بی بی کو دیتے تھے۔ اسی طرح چوب بی بی سے ان کی محبت بڑھتے بڑھتے شرک کی حد تک تجاوز کر چلی تھی۔ ہر شہر کسی نہ کسی صاحب مزار کی حفاظت میں ہے۔ اس کے باوجود دفاع کا بجٹ کی نسبت زیادہ بڑھتا جا رہا ہے۔

اس افسانے "اندھا داو" میں آغا گل نے بلوچستان میں موجود رسم دلور کا بھی ذکر کیا ہے۔ دلور سے مراد وہ مال جو لڑکی والے لڑکے والوں سے اپنی من پسند سے طلب کرتے ہیں۔ اگر مطلوبہ رقم انہیں مل رہی ہو تو وہ رشتہ طے کر دیتے ہیں مثلاً:

"جانول قابیست وجہی، طاقت ور، لیکن غریبی آڑے آڑے آئی باپ
نے بی بی کے لیے زیادہ رمال کمانا تھا۔۔۔" (۶۹)

آغا گل کا افسانہ "جادوگر" ایک انوکھے موضوع پر افسانہ لکھا گیا ہے۔ جس پر شاذ و نادر ادیبوں نے قلم اٹھایا ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے مذہب میں پائی جانے والی برائیوں کا ذکر ہے۔ مثلاً مذہب کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو تسبیح کے دانوں کی گردش میں خدا کو گن گن کر یاد کرنے والے لوگ، یہ وہ دانے ہیں جن پر Abacus کے قدیم عبرانی حساب کیا کرتے تھے۔ لین دین اور سود، مگر دھاگے میں پرو کر پھر اللہ کو یاد کرتے ہیں جیسے خالق کی یاد نہ آئی ہو، آئی ایم ایف کے قرضے کی سود میں تصرف کی ہوئی رقم ہو۔ ویسے بھی روپے اور عقیدے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مذہب

کی آڑ میں لوگ بہت سی برائیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مصنف نے ان کو بے نقاب کیا ہے، کہ لوگ کیسے کیسے جرائم مذہب کو پیشے کے طور پر استعمال کر کے کرتے ہیں۔

معاشرے میں موجود نام پرست افراد پیروں، فقیروں کے مزاروں پر آستانوں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نئے نوٹوں کی کھپت یا تو بازار حسن میں ہوتی ہے یو شادی اور حج مبارک کے ہاروں میں اور جو بچیں وہ آستانوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں رشوت کا انداز روحانی ہو چکا ہے اب رشوت بہت جھک کے ادب سے دی جاتی ہے۔ افسانہ ''چارہ گر'' اسی پیغام کے گرد گھومتا ہے۔ اور اسے ثابت بھی کرتا ہے کہ لوگوں کو رشوت دینے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ وہ پیروں، فقیروں وغیرہ کو رشوت اس لیے دیتے ہیں کہ خدا سے پڑنے والے کام ہوتے رہیں۔ لیکن نام اسے نذرانے کا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو یہ شعبدہ بازی کر رہے ہوتے ہیں انہیں بھی تو اپنے پیٹ پالنے ہوتے ہیں۔ مصنف نے اپنے افسانے میں ''گدی نشین'' پیری، مریدی، رشوت اور سیاست پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''پیران کلیسا کو کلیسا پر بیٹھادو اور پھر بادشاہت کی طرح پیری بھی
موروثی ہوتی ہے۔ پیر کا صاحبزادہ بھی پیدائشی پیر ہوتا ہے۔'' (۷۰)

اسی حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

''۔۔۔۔اب یہ گدی نشینوں کا سلسلہ ہے۔ کیسے بادشاہوں کے
نسل چلتی ہے کہ باپ کے بعد بیٹا اور پوتا اسی مسند کو سجاتا رہے گا اور
اسی طرح یہی خاندان سربراہ رہے گا'' (۷۱)

سیاسی نظام کی خستہ حالی کی وجہ سے بلوچستان کے عوام کے حقوق دوسرے صوبوں کے افراد کو دیئے جا رہے ہیں۔ اور بلوچستانیوں کو اس سے محروم رکھا گیا ہے۔ حقوق کی یہ تقسیم جو کہ مکمل طور پر غیر مساویانہ ہے۔ مصنف اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''بلوچستان کسی معاملے میں بھی خدکفیل نہیں ہے۔ مزدور، کاری گر، فقیر
افسر حتیٰ کہ روزمرہ کے سامان کی طرح ناگزیر طور پر باہر سے منگوائے جاتے

ہیں۔۔۔۔" (۷۲)

"پرتھوی غوری" برصغیر کے ہر اس قاری کو پڑھنا چاہیے جو اردو رسم الخط پڑھ سکتا ہو۔ اور جو افراد انہیں پڑھ سکتے ہیں۔ ان کے لیے ان کے رسم الخط میں منتقل ہونا چاہیے۔ منٹو کا افسانہ "آخری سیلوٹ" بھی اسی موضوع پر تھا۔ دونوں جانب انسان مر رہے تھے لیکن ہم خوش ہو رہے تھے، کہ مسلمان مر رہے ہیں یا ہندو مر رہے ہیں حالانکہ کوئی بھی مذہب آپس میں بیر نہیں سکھاتا۔ [illegible] اپنے [illegible] فرقہ بندی پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ برف کے ستائے ہوئے بھڑیئے تھے نہ تو وہ مختون تھے نہ ہندو اور نہ مسلمان ان کا مقصد صرف اور صرف بھوک مٹانا تھا۔

افسانہ "پرتھوی غوری" دراصل ایک مسلمان اور ایک ہندو فوجی کی کہانی ہے۔ دونوں فوجی برف زاد پہاڑیوں میں راستہ [illegible] حالات، کٹھن صورتحال اور مشکلات جو انہیں پیش آتی ہے۔ موت اور زندگی کی وہ کشمکش یہ افسانہ [illegible] کرتا ہے۔ جب پرتھوی غوری موت سے لڑ رہے تھے۔

ایسے میں [illegible] کہ ان کے مذہب الگ الگ ہیں۔ ان کی شناخت الگ الگ ہے۔ جب موت کی جنگ شروع ہوئی تو [illegible] نے جنگلی بھیڑیوں کی کھالیں اوڑھ لیں۔ تاکہ سردی سے بچ سکیں لیکن وہ نہ بچ سکے جب دونوں [illegible] کی مدد کو پہنچی تو آپس میں لپٹے ہوئے دو انسان پڑے ہوئے تھے۔ یخ بستہ جنھیں، کاٹ کر [illegible] دونوں کا الگ کیے جانا ضروری تھا۔ کیونکہ ایک کو دفنانا تھا۔ اور دوسرے کو جلانا پورے سرکاری اعزاز کے [illegible]

مصنف نے اس افسانے [illegible] بہت عمدہ انداز میں کی ہے۔ مصنف نے عفریت صفت بھڑیئے اور انسانوں کی عادات [illegible] بیان کیا ہے۔ انسانوں میں بھی ان بھیڑیوں کی روح گھس جاتی ہے۔ انسانی روح مغلوب ہو کر [illegible] ہیں کہ:

"[illegible] صفت انسانوں کی شکلیں انسانوں جیسی رہتی ہیں
[illegible] بھڑیئے ہیں۔۔۔ جنسی جنون، وحشی پن، حیوانیت

ہیں۔۔۔۔‘‘ (۷۴)

’’پرتھوی غوری‘‘ برصغیر کے ہر اس قاری کو پڑھنا چاہیے جو اردو رسم الخط پڑھ سکتا ہو۔ اور جو افراد انہیں پڑھ سکتے ہیں۔ ان کے لیے ان کے رسم الخط میں منتقل ہونا چاہیے۔ منٹو کا افسانہ ’’آخری سیلوٹ‘‘ بھی اسی موضوع پر تھا۔ دونوں جانب انسان مر رہے تھے لیکن ہم خوش ہو رہے تھے، کہ مسلمان مر رہے ہیں یا ہندو مر رہے ہیں حالانکہ کوئی بھی مذہب آپس میں بیر نہیں سکھاتا تا آغا گل اپنے مذہبی فرقہ بندی پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ برف کے ستائے ہوئے بھڑیئے تھے نہ تو وہ مختون تھے نہ ہندو اور نہ مسلمان ان کا مقصد صرف اور صرف بھوک مٹانا تھا۔

افسانہ ’’پرتھوی غوری‘‘ دراصل ایک مسلمان اور ایک ہندو فوجی کی کہانی ہے۔ دونوں فوجی برف زاد پہاڑیوں میں راستہ بھٹک جانے پر سارے حالات، کٹھن صورتحال اور مشکلات جو انہیں پیش آتی ہے۔ موت اور زندگی کی وہ کشمکش یہ افسانہ اس تمام صورتحال کی منظر کشی کرتا ہے۔ جب پرتھوی غوری موت سے لڑ رہے تھے۔

ایسے میں وہ بھول چکے تھے کہ ان کے مذہب الگ الگ ہیں۔ ان کی شناخت الگ الگ ہے۔ جب موت کی جنگ شروع ہوئی تو وہ مذہبی جنگ بھول گئے۔ دونوں نے جنگلی بھیڑیوں کی کھالیں اوڑھ لیں۔ تا کہ سردی سے بچ سکیں لیکن وہ نہ بچ سکے جب دونوں طرف سے افواج اپنے ساتھیوں کی مدد کو پہنچی تو آپس میں لپٹے ہوئے دو انسان پڑے ہوئے تھے۔ یخ بستہ، جنھیں، کاٹے بناء الگ کرنا ممکن نہ تھا۔ مگر دونوں کا الگ کیے جانا ضروری تھا۔ کیونکہ ایک کو دفنانا تھا۔ اور دوسرے کو جلانا پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ۔

مصنف نے اس افسانے میں نفسیات کی عکاسی بہت عمدہ انداز میں کی ہے۔ مصنف نے عفریت صفت بھڑیئے اور انسانوں کی عادات و خصائل میں تقابل کو بیان کیا ہے۔ انسانوں میں بھی ان بھیڑیوں کی روح گس جاتی ہے۔ انسانی روح مغلوب ہو کر شکست کھا جاتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ:

’’ ان عفریت صفت انسانوں کی شکلیں انسانوں جیسی رہتی ہیں
دراصل وہ بھڑیئے ہیں۔۔۔ جنسی جنون، وحشی پن، حیوانیت

عقیدوں انسانوں کو تفریق و تقسیم سے بانٹ بانٹ کر مارنا ان
بھڑیوں کا کام ہے۔۔۔۔۔'' (۷۳)

اس افسانے میں منظر کشی بہت خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ مثلاً برف زاد پہاڑیوں کا ذکر کہ کیسے وہاں سناٹوں کا راج تھا۔ درخت لرز رہے تھے۔ ٹھٹھرتے درخت آنے والی رات کے تصور سے ہی کانپے جا رہے تھے۔ رات کا قریب آنا، سورج کی تپش کا چپکے چپکے دبے پاؤں بے جان ہو کر کھو جانا، یخ بستہ ہواؤں کا پناہ گاہوں کی تلاش میں جانا، جہاں دونوں زخمی ایک دوسرے کو گھورے جا رہے تھے۔

مصنف نے ہندی الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں جس سے اسلوب میں شگفتگی پیدا ہو گئی، مثلاً ماتا، سیوا، شردھا، پوجا، بھگتی اور بلیدان، موہ یم دیوتا، سورگباشی، دھرم وغیرہ۔

''بازگشت'' بہت خوبصورت افسانہ ہے۔ ایک ایسا افسانہ جو مکمل طور پر بلوچستان کے ماحول ومنظر کو سامنے لاتا ہے۔ وہاں کی ثقافت، تہذیب اقدار روایات، رسم ورواج کا مکمل عکاس ہے۔ آغا گل کو بلوچستان سے خاص محبت، دلی لگاؤ ہے۔ جس کے پیش نظر وہ بلوچستان کے تناظر میں لکھتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے افسانے میں بلوچستان کے باسیوں، مکینوں کے مزاج اور میلانات کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ بلوچستان کا خاصا یہ ہے کہ افسر اور ماتحت کے درمیان فاصلے نہیں ہوا کرتے۔ یہ طبقوں کا میلان ہے یا کہ دھرتی کا فیضان کہ یہاں محبتیں زیادہ اور دوریاں کم ہیں۔ مصنف نے وہاں کی معاشرت سے بھی قارئین کو آشنا کروایا ہے۔ بلوچ ثقافت میں پڑوسی کے حقوق کو مقدم سمجھا جاتا ہت۔ پڑوسی کو ستانا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اسی طرح وہاں پناہ گزین جو دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے گئے ہوں۔ انہیں باھوٹ (زیرِ پناہ) سمجھا جاتا ہے۔ بلوچستان میں اگر کوئی کسی ذاتی دشمنی یا قبائلی جنگ وغیرہ میں خطرہ ہو تو کسی دوسرے قبیلے کا باھوٹ بن جاتے ہیں۔ باھوٹ کی خاطر جان کی قربانیاں دینے کی بے شمار مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''بلوچ معاشرے میں پڑوسی کو بلا امتیاز، رنگ و نسل تحفظ دیا جاتا ہے

اور بظاہر یہ ممکن نہ تھا۔ کہ براہوی کے ساتھ رہتے ہوئے دور دراز
علاقوں سے آ کر کوئی ان پر حملہ آور ہو۔۔۔۔" (۷۴)

بلوچستان میں اگر لڑکے، لڑکی کے آپس میں ناجائز تعلقات ہوں تو اسے سیاہ کاری کا کیس کہا جاتا ہے۔ علاقے کے قانون کے مطابق ناجائز تعلقات رکھنے والے جوڑے قتل کر دینا عورت کے ورثاء کا قانونی حق ہے۔ ایسے تعلقات کے باعث قتل کو سیاہ کاری کا جرم سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا قبائلی معاشرے میں ایسا قتل قابل تعزیر نہیں ہے۔

"بازگشت" میں مصنف نے نوآبادیاتی نظام کے حوالے سے بھی لکھا جو انگریزوں کے دور میں نظام حکومت چل رہا تھا۔ اس کے مطابق مارچ اپریل میں سبی کے تمام دفاتر زیارت منتقل ہو جایا کرتے۔ یہ نوآبادیاتی چونچلے تھے۔ مگر ایک صدی تک قائم و دائم تھے۔ حکومت نے بھی یہ انداز دلربائی اپنا لیے تمام کے تمام دفاتر مع ریکارڈ، فرنیچر اور سٹاف کے پونے دو سو میل کا سفر طے کرتے۔ ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی عبور کرتے، زیارت جا پہنچتے۔ اکتوبر تک یہ تمام دفاتر زیارت میں کام کرتے۔

بلوچستان میں تہذیبی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو چاکر خان رند کا قلعہ جو صدیوں پرانا ہے۔ بعض کے مطابق وہ قلعہ چاکر رند سے کہیں پہلے کا قلعہ ہے۔ افسانے میں مصنف بلوچستان کے گلی کوچوں، قصبوں، شہروں کا ذکر جب کرتے ہیں تو ایسے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کاغذ پہ انہوں نے اپنا دل نکال کے رکھ دیا ہو۔ بلوچستان کا چپہ چپہ، افسانہ نگار کو جان سے زیادہ عزیز ہے۔ مستونگ آباد جیسا بڑا شہر آباد تھا۔ مستونگ بلوچستان کا دل ہے۔ یہاں سے تین راستے نکلتے ہیں۔ اسی طرح افسانے میں جنگلات اور وادیوں کا ذکر کرتے ہوئے کھو سے جاتے ہیں۔

ایک جدید افسانہ نگار ایک جس کھ جدید یورپی ادب اور مذاہب عالم سے مکمل آشنا ستاون سال گزرنے کے بعد بھی دکھی ہے۔ وہ جب بھی کہانی شروع کرتا ہے۔ تو کہیں کہیں اس لاحاصل کا تذکرہ ضرور نکل آتا ہے۔ اور وہ اپنے مرتبے اور فن کی باریکیوں کے ساتھ سارے تقاضے ایک طرف رکھ کر ننگی حقیقتوں کو موثر انداز میں تاریخی حوالوں سے بیان کرتا ہے۔ مثلاً اپنے افسانے "گنوک"، جس کا براہوی میں (دیوانہ) ہے۔ اس ہجرت سے لٹے پٹے خاندان کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے

دادا پاکستان کا مطلب کیا'' کینعرے لگاتے ہیں۔امرتسر سے اس قصبے میں چلے آئے تھے۔شاید ان کا خیال تھا کہ لاشوں سے بھرے راستوں سے گزر کر وہ اپنے نعرے کا مطلب ڈھونڈ لیں گے دادا کے نعرے کا مطلب نہ ملا۔

ہزاروں افسانہ نگاروں کے جمِ غفیر میں آغا گل کی آواز بڑی ممتاز اور منفرد ہے۔''گنوک، ایڈ کولیم، پوغٹ، ڈاکخانہ ککڑ ،اور روپے کا جن وہ چند نمائندہ افسانے ہیں جن میں آغا گل بین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اچھے کہانی کار، زبان و بیان کے اسرار و رموز سے کما حقہ واقف اور افسانے کا ماحول باندھنے کے ماہر تو نظر آئے لیکن ان کے افسانوں میں تاریخ، یورپی ادب اور قدیم مذاہب کے حوالے میں نے کبھی نہیں دیکھے۔بلوچ تاریخ میں مثلاً ستر اسی برس پہلے فورٹ منرو کی گہرائیوں سے ایک بزرگ اسلام کی سربلندی کے لیے تشریف لائے۔

لارڈ سنڈیمن بھی اس مردم خیز خطے میں آیا تھا۔مصنف کے مطابق ایجی رونلڈ نے Native فوج کے ہمراہ دھاوا بول کر ہماری زمین خون سے لالہ زار بنادی۔وہ بلوچستان سے آزادی کے اثرات مٹانے آیا تھا۔مارتا کاٹتا بلوچستان کے سرحدی ولاقوں تک نکل آیا۔ورنہ سنڈیمن جیسے منکسر المزاج حاکم آئے کہ ایک گولی چلائے بغیر بلوچستان پر قبضہ کرلیا۔

آغا گل کے بیشتر افسانوں میں قدیم واقعے، کسی مذہبی رسم کے حوالےبضر ور ملتے ہیں۔مثلاً اس زیر نظر افسانوی مجموعے میں افسانہ''اندھادان'' اور''جادوگر'' میں توہمات پرستی کا ذکر کیا ہے۔اسی طرح افسانہ''گنوک'' میں بھی توہمات پرستی کے حوالے سے ملتے ہیں۔جہالت اور غربت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔جس کی وجہ سے لوگ بھٹک کر غلط راہوں پر چلنے لگتے ہیں۔اس افسانے میں لوگ''شہید بابا'' کے مزار کے پجاری ہیں۔شہید بابا کو ایک گاؤں والے غلہ نہ بھجوا سکے۔قحط کا عالم تھا، شہید بابا جلال میں آئے اور گول چٹان جس کا وزن ہزار من تھا۔لڑکھڑاتے ہوئے گاؤں کی جانب بڑھے کہ گاؤں کو نیست و نابود کردیں۔خوش قسمتی سے راہ میں کچھ سید مل گئے۔انہوں نے التجا کی کہ غصہ ترک کردیں۔غلہ سال بہ سال پہنچا دیا جائے گا۔اس وعدے پر شہید بابا لوٹ گئے۔

افسانے میں مزاروں، درباروں پر خرچ ہونے والی رقوم کو تنقید کا نشان بنایا گیا ہے۔یہ رقوم سراسر جہالت کے تحت خرچ کی جاتی ہیں۔جنہیں نذرانہ کہا جاتا ہے۔دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں جنھوں نے انسانوں کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔نہ

زراعت کے طریقے بتلائے نہ سائنس کے بارے میں تعلیم دی۔ان کے پجاری بھوکے اور ننگے ہی رہے۔ان رقوم سے یونیورسٹی بن سکتی تھی۔گھروں میں جلانے کو دیئے نہیں قبروں کو چراغوں سے منور کیا جاتا رہا۔مادی جسموں کو روشنی کی ضرورت ہے۔روح تو خود روشنی ہے نور ہے۔مصنف لکھتے ہیں کہ:

''قصبہ گندگی کا ڈھیر بنا ہے۔اور قبروں پر جھاڑ و پھیر رہے ہیں۔اس
دنیا سے منہ موڑنے والے عالم نورانی میں رہیں گے یا ہمارے قصبے کے
جھگڑے نمٹائیں گے'' (۷۵)

افسانے میں سرداری نوابی نظام پر بھی کڑی تنقید کی گئی ہے۔مثلاً یہ کہ ہمارے ہاتھ، پاؤں ہمارے سردار ہیں۔ورنہ تو سردار دیمک کی طرح کھا رہے ہے۔جوؤں اور پسوؤں کی طرح ہمارے خون پر پل رہے ہیں۔

''گنوک''میں شہری زندگی کو بھی مصنف نے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔شہر تیزی سے پھیل رہے ہیں۔جیسے کٹر ابل آتا ہے۔۔ہمارا سب کچھ اپنا ختم ہو رہا تھا۔سارے رسم ورواج اور عقیدے کنوؤں اور کاریزوں میں پھینکے جا رہے تھے۔ کیلیفورنیا گولڈرش کی طرح سارے بلوچستانی دولت کی تلاش میں نکل کھڑے تھے۔رشتوں کا تقدس ختم ہو رہا تھا۔ مصنف کے رمزیئے بڑے چونکا دینے والے ہوتے ہیں۔خاص طور پر ان علامتی افسانوں میں یہ کیفیت بڑی فراواں ہوتی ہے۔جہاں اسے ملبوس کرنا پڑتا ہے۔جیسے حضرت عیسیٰ مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔مگر انہوں نے کسی بے وقوف کو عقلمند نہیں بنایا۔نابینا کو آنکھ مل گئی مگر کسی کو فہم وشعور نہ ملا۔خرِ عیسیٰ گدھے کا گدھا رہا۔اسمبلی کا ممبر نہ بن سکا، نہ قومی نہ صوبائی کا۔

فلسفیانہ عنصر بھی کثرت سے اس افسانے میں دکھائی دیتا ہے۔یہ ہرگز نہیں کہ وہ اپنے وسعت علم کی دھاک بٹھانا چاہتے ہیں۔اور یہ بھی نہیں کہ انہوں نے پورے پورے فلسفوں کی تاریخیں لکھی ہیں اور نہ ہی اپنے کرداروں سے لمبے لمبے ڈائیلاگ اگلوائے ہیں۔بلکہ کہیں آیت، آدھا جملہ اور کہیں ایک سطر، افسانے میں ایسی آ گئی ہے۔جو پورا پیغام دے گئی ہے۔اور افسانے کا مزہ دوچند ہو گیا ہے۔مثلاً گنوک زندہ رہتے ہیں، عقلمند نہیں اور نہ ہی سچ بولنے والے زیادہ دن جیتے

ہیں۔ گنوک پتھر بھی ماریں تو معاف کر دیا جاتا ہے۔ They die young who speak truth عقلمندوں نے اکثر خود کو دیوانہ مشہور کیا جیسے دیو جانس کلبی جب کہ اکثر احمق خود کو عقلمند ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ ہمیشہ عقلمندوں کے سر ہی قلم ہوئے ہیں، بے وقوفوں کے نہیں۔

افسانہ ''گنوک'' میں براہوی معاشرے کے رسم و رواج کے حوالے ملتے ہیں جیسے اس سے قبل بیشتر افسانوں میں جن میں ''بازگشت'' اور ''اندھا دن'' شامل ہیں۔ جب براہوی معاشرے میں، قبیلے میں فیصلے لیے جاتے ہیں تو اس قبیلے یا قوم کے تمام بڑے بزرگ سمجھدار لوگ جنھیں عرف عام میں براہوی میں (ٹکری) کہا جاتا ہے۔ وہ شمولیت اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی غیر مقامی کسی قبیلے میں شامل ہونا چاہتا تو اس کے لیے چند رسوم ادا کرنا ضروری ہوتی ہیں۔ آغا گل اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''ہڈ پیر غنگ کی رسم کے ذریعے مقامی قبیلے میں شمولیت اختیار کر لی جاتی ہے۔
> دین دھرم بدلا جا سکتا ہے مگر قومیت نہیں۔ یہ افتخار صرف براہوی معاشرے کو
> حاصل ہے۔ کہ محض ایک رسم ادا کر کے کوئی بھی شخص براہوی قوم میں ضم ہو سکتا
> ہے'' (۷۶)

بلوچ ثقافت کی خصوصیات پر اگر نظر ڈالی جائے تو بلوچ ثقافت میں پڑوسی کے حقوق کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ افسانہ ''بازگشت'' میں بھی مصنف نے پناہ گزین (باھوٹ) کا ذکر کیا ہے۔ کہ دوسرے علاقوں اور قبائل سے آنے والے لوگوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ ان سے عزت و احترام سے پیش آیا جاتا ہے۔ افسانہ ''گنوک'' میں جب مزار کی تعمیر کے حوالے سے جب انگریز نذرانہ دینے آئے تو لوگ پس و پیش سے کام لینے لگے لیکن مشترکہ فیصلے کر کے قبول کر لیا گیا۔ کیونکہ برٹش بلوچستان کا ایک انگریز کپتان آن پہنچا زیر تعمیر مزار کو سلامی دی۔ نقد پیش کیا سالانہ گرانٹ دی لیکن شیخ صاحب نے توجہ دلائی کہ کفار از خود خراج ادا کرنے پر رضامند ہیں۔ انگریزوں کو شہید بابا کا معتقد جان کر باھوٹ کا درجہ دے دیا جائے گا۔

''گنوک'' کا موضوع پوری انسانی تاریخ کا بار بار دہرایا جانے والا المیہ ہے۔ ماضی سے چمٹی ہوئی اکثریت اپنے آپ کو عقلمند سمجھتی ہے۔ اور تبدیلی کا طالب حقیقی عقلمند کو پاگل قرار دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی فروشی سودمند کاروبار ہے۔ جسے مذہب کی پڑیا میں لپیٹ کر بیچا جاتا ہے۔ اس کاروبار پر جب ضرب پڑتی ہے تو آپس میں چھینا جھپٹی کرنے والے متحد ہو کر مشترکہ دشمن کو پہلے شیخ برہمن کے کہنہ دلائل پر سزا سناتے ہیں۔ اور جب دلائل سے کیا جائے تو پھر پیرِ زنداں کر دیا جاتا ہے۔ اس روایت کی ابتداء سقراط کو زہر دینے سے ہوئی تھی۔

''کھلی والا'' ایک ایسا افسانہ ہے جس سے آغا گل کی وسعتِ علمی کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے ادب اور ادیبوں کے حقوق کی جنگ کو موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے قانون کے ذریعے ادیبوں کو اپنے افسانے ''مساویانہ حقوق دلانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ چاہتے ہیں کہ قانون تمام ادیبوں، شاعروں، لکھاریوں، قلم کاروں کو ادبی مزدور قرار دے۔ آئین میں ایک شق رکھی جائے عام مزدوروں کا بھی طے شدہ اصولوں کے مطابق معاوضہ دیا جائے۔ کیونکہ ادب انگور کی بیل کی طرح ادیبوں کا خون پی کر بڑھ رہا ہے۔ دنیا میں ہر ہنر کا معاوضہ ہے۔ ادیبوں کو لیکن کچھ نہیں دیا جاتا۔ محنت کا معاوضہ ادا کرنے کا حکم آسانی بھی ہے اور عالمگیر بھی مگر ادیبوں کی اور کے کام کی نہ کوئی قانونی تعریف ہے نہ معاوضے کا تعین۔ محنت کشوں کا یہ طبقہ Highly skilled labour کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کو زیادہ معاوضہ ملنا چاہیے وہ بھی بطور اعزاز نہیں بطور حق As a legal right کیونکہ یہ عزت و تکریم لفاظی کی حد تک محدود ہے۔ الفاظ مایا کا جال ہیں۔ لفظوں سے پیٹ نہیں بھرتا اگر ایسا ہوتا تو روسو بھوک سے بے حال ہو کر اپنے ہی جگر گوشوں کو یتیم خانے نہ چھوڑ آتا۔ جہاں یہ بچے اسے دوبارہ نہ مل سکے۔ ہومر جیسا عظیم شاعر بھی جس نے تین عظیم تخلیقات کیں، بھوکا ہی سویا۔ دیوجانس کلبی لکڑی کے ایک خالی پیپے میں کبھی ٹاور آف لندن میں قید کیے گئے کبھی انہیں زندہ جلایا گیا۔

مصنف افسانہ میں تاریخ انسانی کے حوالے سے بھی بات کرتے ہیں۔ ''کھلی والا'' اس افسانے کے مرکزی کردار ''کھلی'' کے نام کا تاریخی حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت عباس علم دار نے معصومین کے لیے کھلی اٹھانے سے بیشتر

اطاعت امام میں ہتھیاروں سے ہاتھ اٹھالیے تھے۔کھلی اٹھانا ہتھیار اٹھانے سے کہیں دشوار تر ہے۔دشمنوں کے گھیروں کو تن تنہا توڑتے ہوئے وہ کھلی میں پانی بھرلائے کہ امام پیاسے ہیں۔تاریخ انسانی کی نا قابلِ تقلید مثال ہے۔کھلی والا واقعہ تاریخ انسانی کا اہم موڑ قرار دیتا ہے۔اسی طرح تاریخ کے حوالے سے ولیم کیکلس کا نام لیتے ہیں۔کہ وہ کوئی ادبی شخصیت نہ تھے۔انہوں نے چھاپہ خانہ ایجاد کیا تھا۔مگر تاریخ کا باب ہی اس کے بغیر مکمل نہیں ہے۔اور پادری ولیم کیری جس نے ۱۸۲۵ء عیسوی میں متی، مرقس، لوقا کا بلوچی ترجمہ شائع کیا۔براہوی زبان اور اس کی خصوصیات اور وسعت کے متعلق بھی معلومات ملتی ہیں مثلاً

''نود براہوی زبان میں بادل کو کہتے ہیں۔اور نود بندغ کا مفہوم ہے۔
بادلوں کو قابو کرنے والا شاید نو بندغ قبل از تاریخ بارش کے یوقا کا نام
رہا ہو'' (۷۷)

براہوی ایک وسیع زبان ہے۔حتیٰ کہ مشک اور مشکیزہ کے لیے اس میں بے شمار لفظ ہیں۔جن کا مترادف دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتا۔ایک سبب یہ ہے کہ دس ہزار براہوی خود کفیل رہے۔ضروریات کی تمام اشیاء خام مال سے ہی بنالیا کرتے۔خودداری اور خود کفالت لازم وملزم ہے۔ایزک (دہی لسی کا مشک)، زک (گھی کا مشک)، دبہ (تیل کا مشک)، امیان (آٹے کا مشک)، گونچان (آٹے کا سفری مشک) کیت، (آٹے کا درمیانی مشک)، خواہ (پانی کا مشک) کھلی (پانی کا چھوٹا سفری مشک) وغیرہ۔براہوئی قبائل اور قوم کی خصوصیات کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ:

''ہزاروں برس سے براہوی بکری کے بالوں سے بنے گیدان میں رہتے
چلے آئے ہیں۔دیواروں کا قیدی، چھتوں کے اسیر ہونا، ہماری فطرت نہیں
ایسے ہی تو بلوس (طاقت ور)، بل اوچ، بل وان نہیں کہلائے۔۔۔۔'' (۷۸)

افسانے میں ترقی یافتہ ممالک میں معاشی بدحالی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ترقی یافتہ ممالک جو کل دنیا کی بیس صدی بلکہ اس سے

بھی کچھ کم ہیں۔اگر شلوار قمیض پہننے لگیں تو اپنا بھی پہناوا خود بہ خود قومی رنگ میں رنگ جائے مجبوراً عوام مغربی لباس پہنتے ہیں،آخر کیا کریں کباڑی میں ملتا ہی یہی کچھ ہے۔

''آکاش ساگر'' یہ وہ افسانہ ہے جس میں مصنف بلوچستان کی تاریخ کا ست نکال کر رکھ دیا ہے۔وہ بھی چند صفحات میں ان معلومات کو پڑھتے ہوئے یہ خیال ذہن میں در آتا ہے۔کہ ان تاریخی معلومات کو افسانے کی ہیت میں کیسے ترتیب دیا گیا ہے۔زمینی ارتقاء کی تاریخ اور اور بلوچستان کے وجود میں آنے کہ دس ارب سال گزرے اور ایک مہیب زلزلہ آیا اور پھر پانیوں کے نیچے جہاں سرکتے ہوئے Discs براعظموں کو لیے پھرتے ہیں۔خوف ناک دھماکہ ہوا اور سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے بالکل پاتال سے بلوچستان باہر آ گیا۔

براہوی قبائل کی تاریخ کے متعلق افسانے میں لکھتے ہیں کہ جس سے سادگی،سچائی اور من کا کھرا پن کہانی پر چھا جاتا ہے۔وہ عام انسانوں سے بلند دکھائی دیتے ہیں۔آغا گل کے افسانے Sentimental regional tale کے زمرے میں آتے ہیں۔مثلاً بنجر دھرتی پر انسان گھومنے پھرنے لگے،زندگی دشوار تھی۔اور ان دشواریوں نے جینے والوں کو سخت جان ،باہمت بنا دیا۔دنیا انہیں بیلوس (طاقت ور)،اور بلوان اور براہوی کہنے لگی،ان کی دھرتی کا بل اوچ ستان کا نام دیا گیا ۔یعنی طاقت ور لوگوں کا مسکن وہ اپنی بقاء کے لیے ایک ایسی جنگ لڑنے لگے۔جو ان پر مسلط کی گئی تھی۔

براہوی زبان جو یوں بھی ایک غیر تحریری زبان تھی۔لکھنے کی فرصت کسے تھی۔تحریریں تو دریاؤں کے کنارے پر رہنے والے وضع کیا کرتے ہیں۔آغا گل کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ بلوچستان کے بھرپور نمائندے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔انہوں نے بلوچستان کی تاریخ،معاشرت،کلچر کو پیش کرتے ہوئے انسانیت اور انسانی اقدار پر زور دیتا ہے۔اپنے افسانے'' آکاش ساگر'' میں براہوی قبائل اور ان کی معاشرت کے حوالے سے لکھتے ہیں

''سمند کی طرح بلوچستان پر کوئی بھی حکمران اپنی یادگار قائم نہ کر سکا۔۔۔۔

براہوی صحراؤں میں بکھرے ہوئے تھے۔منتشر اور خانہ بدوش اقتدار کے

ایوانوں سے دور رہے نہ سنگ مانتے ہیں نہ بدرقہ فراہم کرتے۔۔۔'' (۷۹)

ایک اور مقام پر یوں رقم طراز ہوتے ہیں کہ:

''براہوی صحراؤں میں اکیلے رہ گے وہ تو نئی منزلوں کی جان مراجعت

کرتے ہوئے پڑاؤ کی دیواریں بھی گرا جایا کرتے تھے۔۔۔'' (۸۰)

افسانہ میں تہذیبی نقطہ نظر کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ کہ کیسے ساسانی اور عرب دراوڑوں پر چھا گئے۔ کیونکہ ہر نئی تہذیب پرانی تہذیب کے کھنڈروں پر اپنے محل تیار کرتی ہے۔ اور اس دنیا میں کچھ بھی نیا نہیں۔ مصنف نے گزشتہ حکومتوں کے نظریات و اعمال کو بھی اپنے افسانے کے زریعے طنز کا نشانہ بنایا۔ بلوچستان میں پہلی حکومت ٹوٹی اور پھر نئی حکومت جب آئی تو پرانی حکومتیر غداری کے لیبل لگائے گئے، اور نئی حکومت کا نعرہ گونجا، دشت وجبل میں روٹی، کپڑا، مکان۔ اس میں رمز وکنایہ تھا۔ کھانے کو جیل کی روٹی، پہننے کو جیل کی وردی مفت۔

آغا گل سماج کی بے اعتدالیوں کا زمہ دار محض کسی آمر یا فرد واحد کو قرار نہیں دیتے بلکہ Consequence of the rapid growth and change of the time ہے۔ آغا گل کا اپنے Problemtic time کا شکار ہیں۔ خود کش حملہ آور اور بم دھماکے، ٹارگٹ کیلنگز، علاوہ ازیں حد درجہ Ethnic نفرتیں Racial inequality open expoure of criminaled اس کے موضوع ہیں۔ ''آکاش ساگر'' ایٹمی دھماکے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''جب ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو (راسکوہ) میں ایک ہیبت ناک دھماکہ ہوا۔ اور

زمین لرز اٹھی Zhob mother اوندھے منہ جا گری، ننھی بھاگ

کر باہر دوڑے خوشی سے کہ آکاش ساگر لوٹ آئے۔۔۔۔ لیکن آسمان پر

آلودگی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ دھندلی فضا میں نظر دوڑانے سے احساس ہوا

آکاش ساگر اور بھی دور ہوئے جا رہے ہیں۔۔۔ بہت دور۔۔'' (۸۲)

مصنف نے اپنے بیشتر ناولوں اور افسانوں میں مسیحت کے حوالے سے بھی لکھا ہے۔انہوں نے مسیحت کا احترام سے کیا اور مسیحی مسلم کمیونٹی کے مابین ایک پل کا کام کیا۔دونوں کو ذیلی طور پر قریب لایا۔''آ کاش ساگر'' ایسا افسانہ ہے۔جس کا آغاز ہی آغا گل نے ''توریت'' کی پہلی کتاب پیدائش سے کیا ہے۔تقریباً اپنی تمام تحریروں میں جس طرح بائبل مقدس کے حوالے لاتے ہیں۔اسی طرح آیات بھی کوٹ کرتے ہیں۔جو پڑھنے والوں کو دریائے حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔

افسانہ ''پوغٹ'' ایک بہت عمدہ افسانہ ہے۔آغا گل نے براہوی اور بلوچی زبان کو بھرپور طور پر اپنے افسانوں میں متعارف کرایا ہے۔انہوں نے اپنے اکثر افسانوں کے نام براہوی اور بلوچی سے لیے ہیں۔بلوچستان کی زبانوں کو پڑھا بلکہ ان کی جڑوں تک مکمل شناسائی حاصل کی۔آغا گل انگریزی اور اردو ادب کے فارغ التحصیل عالم ہیں۔لہذا اس ساری آگہی نے ان میں زبانوں کے اختلاط و امتزاج کا ایک قابلِ قدر سلیقہ پیدا کر دیا ہے۔یہی وجہ
ہے کہ براہوی اور بلوچی زبان کی اصطلاحیں ان کے افسانوں میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

انہوں نے اپنے افسانوں کے نام گنوک (دیوانہ)، پوغٹ (مینڈک)، کا کردار حقیقی یا فرضی افسانہ نویس کے پختہ ہونے کا ثبوت ہے۔مثلاً وہ پوغٹ کدار کا حلیہ ایسے لکھتے ہیں کہ پستہ قد، گنجا سر، بڑا دہانہ ایک بوڑھا سا، بھدا سا مفلوک الحال انسان تھا۔پوغٹ کہلانے کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ایک دفعہ ایک بچہ جو اپنے والدین کے ساتھ گھومنے آیا ہوا تھا۔اس نے ایک آدمی کو دیکھا اور پوغٹ، پوغٹ، (مینڈک، مینڈک) کہنے لگا۔وہ خوب قہقہے مار کے ہنس رہا تھا، والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔پوغٹ نے بچے کی یہ محبت دیکھی تو جھٹ سے منہ میں انگلیاں ڈال کر دہانہ کانوں تک کھینچا اور مینڈک کی آواز بنا کر ٹرانے لگا۔باپ نے خوش ہو کر پوغٹ کو ایک روپیہ دیا تو پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔

مصنف نے اپنے افسانے میں غربت زدہ ماحول کی عکاسی کی ہے کہ کس طرح ایک غریب شخص معاشی صورتحال سے تنگ آ کر خود چڑیا گھر کے کسی پنجرے میں قیدی بنا کر رکھنے کی ضد کرنے لگا۔اپنے انچارج سے کہتا ہے کہ کئی پنجرے خالی ہیں مجھے بھی پنجرے میں ڈال دیں۔تمہیں مذاق میں پوغٹ کہا جاتا ہے۔تم حقیقی پوغٹ تو نہیں، اب اگر بکواس کی تو دھکے دے

کرنکال دوں گا۔ پوغٹ غصے میں کہتا ہے کہ تو باقی جانوروں کو کیوں نہیں نکال دیتے؟ کمال ہے وہ پنجروں سے بھاگنا چاہتے ہیں اور میں خوشی سے آنا چاہتا ہوں جانوروں کے چڑیا گھر میں کھانا مفت ملتا ہے۔

نہ کرایا کی فکر نہ پانی کا بل، جب انسان غربت سے تنگ آتا ہے تو کچھ بھی کرنے کو تیار ہوجاتا ہے۔اور اکثر اوقات غربت سے بے حال افراد ذہنی توازن بھی کھو بیٹھتے ہیں۔مثلاً اس افسانے''پوغٹ'' میں آغا گل اس کردار کی ذہنی کیفیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''میرے دشمن تو مچھر ہیں، کھٹمل ہیں، پسو ہیں، بچھو ہیں، ان کو مار دان کے لیے اسلحہ بناؤ۔ایسی بندوق جو مکان بنادے۔ایسی توپ بناؤ جس کے فائر سے آٹے کی بوری آجائے، ایسا راکٹ بناؤ کہ جس کے داغنے سے غربت مرجائے'' (۸۳)

''پوغٹ'' میں بلوچستان کی بلند و بالا برفانی چوٹیاں بھی ابھرتی دکھائی دیتی ہیں۔

''کبھی کبھی سرد راتوں میں جب غلیفت، تکلو، اور چہار غاش کی چوٹیوں سے برفانی ہوائیں اترتیں تو۔۔۔۔سوچ کر ہی کانپ کے رہ جاتا ہے'' (۸۴)

آغا گل بلوچستان کے نمائندہ ادیب ہیں۔انہیں جتنے نقادوں نے بھی پڑھا بلوچستان تک محدود کر رکھا ہے۔یہ درست ہے کہ آغا گل بلوچستان کا باشندہ ہے۔ان کی کہانیوں کا مواد، کردار وہیں سے تعلق رکھتے ہیں۔جنہیں پڑھتے ہوئے قاری کو بلوچستان کے متعلق کافی معلومات ملتی ہیں۔تاہم خلاف انسانیت جو حرکات ہیں وہ صرف بلوچستان تک ہی محدود نہیں ہیں۔بدی کی فتوحات تو پورے کرہ ارض کو محیط کرتی ہیں ہاں طریقہ واردات مختلف ہوسکتا ہے۔

آغا گل کا افسانہ''خان مستانہ'' ایک عمدہ افسانہ ہے۔''خان مستانہ'' بلوچستان کے پس منظر میں لکھا گیا۔یہ ایک کرداری افسانہ ہے۔جس میں معاشرے میں موجود تلخ حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے۔مثلاً رشوت اور سفارش جیسی سماجی برائیوں کا ذکر مصنف نے تاریخی حوالوں سے کیا۔کہ پرانے زمانے میں بادشاہ جو سوچتے اس کے مطابق فیصلہ صادر کرتے اگر پھانسی کا پھندا کسی ملزم کے گلے میں فٹ نہیں آتا تو جس کے گلے میں فٹ آتا اسے پھانسی لگادیا جاتا۔سرکاری ملازمت میں جس کی سفارش ہو اس کی تبدیلی کے احکامات روک کر کسی بغیر سفارشی ماتحت کو حکم دے دیا جاتا ہے۔سرکاری ملازمین کی زندگی

سمجھوتے کا نام ہے۔سرکاری ملازم کو زندگی ویسے بھی بھینس کی طرح گزارنی چاہیے۔دن بھر چرتی رہے۔۔سینگ پر کوا بھی آن بیٹھے تو پروا نہیں ۔سرکاری ملازموں کو اپنا نشان بھینس تجویز کرنا چاہیے۔اگر بھینس عقلمند ہو تو اپنا دودھ خود استعمال کرے۔سارا دن کشک گھاس اور کاغذ کے لفافوں پر منہ مارتی پھرتی رہتی ہے سرکاری ملازموں کی طرح۔

افسانہ'' خان مستانہ'' میں بلوچستان میں پائی جانے والی معاشرتی برائی سمگلنگ کا احوال بھی بیان کیا ہے۔پاکستان ،افغانستان کے درمیان سمگل ہونے والا مال کیونکہ افغانستان کے پاس سمندنہیں ہے۔افغانستان کو پاکستان سے ٹرانزٹ درکار ہے۔افغانستان کا مال کراچی سے کوئٹہ اور پھر چمن جاتا ہے۔جہاں سے سرکاری کاغذات میں ٹرکوں میں مال بھر کر افغانستان بھجوادیا جاتا ہت۔درحقیقت دوبارہ کوئٹہ سے کراچی چلا جاتا ہے۔مصنف سمگلنگ کے حوالے سے ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:

'' کوئٹہ سے ٹرین آتی تو بازار میں چہل پہل ہو جاتی غیر ملکی مال خریدتے
ٹرین کے آتے ہی دو گھنٹوں کے لیے نرخ بڑھ جاتے۔۔۔۔۔کراچی
کی ہی چیزیں ضرید کر کراچی ہی لے جایا کرتے ،پاکستان دنیا کا واحد ملک
ہے جہاں اپنی ہی مصنوعات سمگل ہوتی ہیں۔'' (۸۵)

افسانے میں کردار'' خان مستانہ'' کے ذریعے بلوچستان کی معاشرت،ثقافت کی عکاسی بہت عمدہ انداز میں کی ہے۔اس کا حلیہ،رکھ رکھاؤ،رہن سہن،مثلاً اسکے پہننے اوڑھنے کے حوالے سے لکھتے ہیں۔کہ پروقار شخصیت،متاثر کن آنکھیں،اچک زئیوں والی مخصوص پگڑی،ہاتھ میں فیروزہ کی تسبیح،نہایت شریف النفس انسان تھا۔کروڑوں کا کاروبار تھا۔مگر سادہ زندگی اختیار کر رکھی تھی۔قبائلی جھگڑوں میں کبھی حصہ نہ لیتا۔صلح کروانے کی کوشش میں پیش پیش رہتا۔

آغا گل نے افسانے میں بلوچستان کے شہروں اور خاص طور پر چمن کی عکاسی خوبصورت انداز میں کی ہے۔چمن نام کی مناسبت سے وہ لکھتے ہیں کہ:

'' کراچی سے آنے والے جو نہیں جانتے تھے کہ چمن لال کے نام سے
منسوب ہے،پہلے تو گلستان،گل وبلبل کو نہ پاکر مایوس ہوتے نام کی

نسبت سے سیبوں سے لدے پھندے باغوں والے شہر کی آرزو رہتی

یہاں ویران پہاڑی سلسلے تھے اور بے آب وگیاہ پتھر یلے میدان۔

"----- (۸۷)

بلوچستان کے سیاسی حالات کی خرابی اور ناقص کارکردگی کا احوال جو اس سے قبل بیشتر ناولوں اور افسانوں میں بیان کر چکے ہیں۔کوئٹہ سے چمن کا فاصلہ ۷۵ میل کے قریب ہے۔مگر ہر محکمے ہر ایجنسی نے اپنی اپنی زنجیر لگا رکھی ہے۔مختلف محکموں کی پندرہ کے قریب بلا مبالغہ چیک پوسٹیں ہیں۔کوئٹہ سے چمن جاتے آتے ان چیک پوسٹوں پر بسوں اور مسافروں سے نذرانے لیے جاتے ہیں۔بلوچستان میں اس قدر چیک پوسٹیں ہیں۔کسٹم ہر ملک کی سرحد پر ہوا کرتا ہے یہاں تین بار کسٹم کی چیک پوسٹوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

''پو بندغ'' آغا گل کا علامتی افسانہ ہے۔پو کا مطلب رینگنے والا کیڑا ہے۔اس افسانے کا پیش منظر اور پس منظر بلوچستان ہے۔بلوچستان میں سیاسی نظام، سرداری ونوابی حکومتوں پر مبنی ہے۔جس سے حکومت کی سیاسی نظام ناقص کارکردگی سامنے آتی ہے۔

افسانے کی کہانی بلوچستان کی مچ جیل جو ۱۹۶۷ء میں انگریزوں کے دور حکومت میں قائم کی گئی تھی۔اس میں موجود قیدیوں کی زندگیوں پر مشتمل ہے۔مصنف نے ان حقائق کو سامنے لایا ہے کہ کیسے سردار، نواب اپنی سیاست چمکانے کے لیے نوجوانوں کا استعمال کرتے ہیں۔ان کی زندگیاں داؤ پر لگا کر حکومتیں کرتے ہیں۔اور معصوم دلوں میں انتقامی جذبات کی آگ بھڑکا کر انہیں لڑواتے ہیں۔افسانے کا مرکزی کردار ''دینار'' بھی کچھ اسی طرح کے سرداروں کے ہاتھوں تباہی، کے دہانے پہنچا۔کیسے سرداروں نے اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔دینار دراصل سردار کے بیٹے کا ہم عمر تھا۔سردار نے علاقے کے بہت سے نوجوانوں کو لاج بھجوایا تا کہ پارٹی کی ایک شاخ Student wings کے طور پر کام کرے۔طلباء نے سردار کے اشارے پر بیان بازی شروع کر دی۔اپنے علاقے میں بسنے والے قبیلے کے خلاف محاذ کھڑا کر دیا۔حالاں کے ہزاروں برس کا ساتھ تھا۔سینکڑوں برس پرانی وفاداریاں تھیں۔کئی بار کالج میں دونوں قبیلوں کے

نوجوانوں کو جھگڑا بھی کروادیا گیا۔ مصنف سیاست اور قبائلی نظام، قبائلیت کی پرورش کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

"قبائلیت کے ساکن اور گھٹے گھٹے ماحول میں پو (رینگنے والا کیڑا) بن کر
پیدا ہوا، سرداروں نے وقت کو ہزاروں برس سے روک رکھا ہے۔ اور ٹھہرے
پانی کو جوہڑ کہتے ہیں اور جوہڑوں میں صرف "پو" ہی پیدا ہوا کرتے ہیں" (۸۹)

سیاسی نظام کی ناقص کارکردگی کے ذریعے انسانیت پر ہونے والے مظالم کو اگر دیکھا جائے تو گدھوں سے زیادہ بوجھ لاد دیا گیا ہے۔ نفرتوں، نظریات، جغرافیائی حدود، معاشرتی گروہ، خاندان، کا جسے کمزور انسان نہیں اٹھا سکتا۔ مصنف نے افسانے میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ لوگوں کو ان کی بنیادی ضروریات اور حقوق سے محروم رکھنے کی سازش صدیوں سے چل رہی ہے۔

آغا گل نے ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ اپنے کرداروں کے ذریعے نوجوان طبقے کو کہ کبھی بھی خود کو مفاد پرست طبقے کی خاطر ضائع نہ کریں۔ ان کے بنیادی حقوق پورے نہ کرنے والے انہیں محض استعمال کر رہے ہیں۔ کیوں کہ حقوق یہ ہیں کہ ہمیں بجلی، گیس، پانی، ملازمت اور تعلیم ملے۔ ہمارے علاقوں میں سڑکیں ہوں۔ ہماری فلاح کام کرنے میں ہے۔ ہڑتال کرنے میں نہیں۔ حکومت کا ساتھ دینے میں ہے۔ بغاوت اور شورش میں نہیں۔ سرداروں، نوجوانوں کے بچے ایئر کنڈیشن گھروں میں رہتے ہیں۔ ان کے بیٹے ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں یا غیر ممالک میں پڑھتے ہیں کسی سردار کے بیٹے کو آج تک لاٹھی چارج نہیں ہوا۔ ڈنڈے نہیں لگے۔ کبھی عوامی تحریک میں گرفتار نہیں ہوئے، ہم سڑکوں پر ڈنڈے کھاتے ہیں، جیلوں میں جاتے ہیں اور کوئی مر جائے تو سردار کا منشی جا کر صرف یہ کہتا ہے سردار صاحب کو اس کی موت کا بڑا دکھ ہے۔

"پو بندغ" میں مصنف نے جیل اور معاشرے کی تفریق پیش کی ہے کہ جیل میں دیواریں نظر آتی ہیں۔ اور معاشرے میں طلسم ہوش ربا کی طرح نظر آتی ہیں۔ جیل میں محسوس ہوتا ہے کہ طاقت ور نے انہیں الگ الگ

بارکوں میں کھولیوں میں، چکیوں میں پھانسی گھاٹوں میں بند کر رکھا ہے۔ جب کہ معاشرے میں یہ سب غیر محسوس انداز میں ہے۔ مصنف نے بلوچستان جیل کی منظر کشی کی ہے۔ اور ساتھ ہی اس کے حالات کو بھی بیان کیا ہے۔ کہ وہاں پر موجود قیدی کیسی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''جیل عام معاشرے سے بہتر ہے اگر پابندیاں نہ ہوں تو گوارہ ہے۔
مذہبی لسانی اور گروہی تعصبات بھی نہ تھے قیدی آٹھ گھنٹے اپنی اپنی مشقت
سرانجام دیا کرتے نہ جلسے جلوس، نہ مقابلے، نہ سٹیٹس کی دوڑیں سبھی ایک
دوسرے کے ساتھی براہوی بیمار ہے تو پشتون اس کا سردبا رہا ہے۔ پنجابی
قیدی کی والدہ کی موت کی خبر ملی تو بلوچ فاتحہ خوانی کروا رہا ہے۔ بنگالی ء کے
پاس وطن واپس خط بھجوانے کے پیسے نہیں تو کوئی ہزار بیرون ملک ڈاک
کے لفافے منگوا رہا ہے۔۔۔'' (۹۰)

بلوچستان جیل میں موجود بنگالی قیدیوں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ نہ کوئی ملاقاتی تھا۔ اپنوں کا انتظار کر کر کے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ زندگی کے دن پورے کیے جا رہے تھے۔ افسانہ نگار نے ان بنگالیوں کی حالتِ زار کا ذکر کیا ہے

''مقامی کہلانے کے لیے ضروری ہے کہ صوبہ بلوچستان میں زمین اگرچہ
''ابوالفضل غیر'' قانونی تارکین وطن کے زمرے میں آتا تھا۔ سچ میں
وہیں اسے زمین الاٹ کر دی گئی۔ چھ فٹ لمبی اور چار فٹ گہری جہاں
وہ پاسپورٹ کے بغیر بھی رہ سکتا تھا۔۔۔'' (۹۱)

''مٹی بکتی ہے'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں سماجی زندگی تلخ حقیقتوں کو بہت عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جو افسانہ نویس کے ہنر کے عروج پر ہونے کا ثبوت ہے۔ اس افسانے میں جا بجا مذہبی حوالے اور قدرتی آفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً ''قسم ہے (ہواؤں) کی جو پے در پے بھیجی جاتی ہیں۔ پھر لا فانی رفتار سے چلتی ہیں اور (بادلوں) کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں۔ پھر ان کو پھاڑ کر جدا کرتی ہیں۔ پھر (دلوں میں خدا کی) یاد ڈالتی ہیں۔ عذاب کے طور پر یا ڈراوے کے طور

پرٗ'' افسانہ نگار نے قرآنی آیات سے استفادہ کیا ہے۔

اس افسانے میں افغان امریکہ جنگ کو بنیاد بنا کر انسانی لاشوں کی تذلیل دکھائی گئی ہے۔ کہ کیسے حالات نے بیٹے کو مجبور کیا اور اس نے اپنے باپ اور قاقا کی لاشیں بیچ دیں۔ ''مٹی بکتی ہے'' ایک ایسا افسانہ ہے جسے پڑھ کر انسان جسماً اور ذہناً لرز جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خیال آتا ہے کہا سے لکھتے ہوئے افسانہ نویس کتنے عذابوں سے گزرا ہوا ہوگا۔

ہم جسے افغان جہاد کہتے ہیں اس میں افغانوں کو مار رہے ہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو وہاں وہی افغان لاشیں دکھا دکھا کر اپنے امریکیوں سے ڈالر وصول کر رہے تھے۔ زندہ انسانوں کو شہیدوں کا گیٹ اپ دے کر تصویر بنالاتے اور امریکیوں سے فی شہید طے شدہ معاوضہ طلب کرتے۔ امریکی بھی اس فراڈ سے تنگ آ گئے۔ پھر وہ لاش دیکھ کر معاوضہ دیا کرتے۔ لاشوں کا قحط پڑا تو مرے ہوئے چچا، ماموں، یا باپ کو ایک برسٹ مار دیا کرتے یوں لگتا لڑائی میں مارا گیا۔ اپنے دام کھرے کرتے، مانگ بڑھی تو تازہ دفنائے ہوئے مردے اندھیرے میں نکال کر برسٹ مارتے۔ بلوچستان میں شہریوں نے گھبرا کر قبرستانوں میں چوکی دارہ نظام رائج کر دیا۔ اس بے حسی کے حوالے سے مصنف رقمطراز ہے:

'' قاقا کی حالت نازک ہو چکی ہے، مجھے قیمت ادا کر دو۔۔۔۔۔۔۔

مگر یہ تو ابھی زندہ ہے، امریکی ایجنٹ نے اعتراض کیا۔ ٹھیک ہے مجھے

فی الحال اس کا بیعانہ ہی دے دو'' (۹۲)

اس جہاد کی مزید جھلک خالد حسینی کے ناول ''پتنگ باز'' میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ افسانہ ''مٹی بکتی ہے'' میں افسانہ نگار نے تاریخی حوالے بھی دیئے کہ ماضی میں لڑی گئی جنگوں میں کیا طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۷۹ء میں کیمونسٹوں کے خلاف دنیا بھر کے سرمایہ داروں نے یلغار کی جنگ کا آغاز ہوا تو اچانک رقابتیں، کدورتیں، نفرتیں اور دشمنیاں پھوٹ پڑیں۔ آگ کی فصل روبل اور ڈالر بارش میں پنپنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان دوسرا ویت نام بنتا جا رہا تھا۔ مگر ویت نام میں اٹھاون ہزار امریکی کیفرِ کردار کو پہنچے تھے۔ یہاں تو افغان ہی قاتل تھے، وہی مقتول وہی گورکن اور وہی نوحہ

خواں۔

''سر لک'' مجموعے ''پرتھوی غوری'' کا آخری افسانہ ہے۔ یہ افسانہ مکمل طور پر بلوچستان کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ بلوچستان میں موجود سماجی مسئلے کی طرف توجہ مرکوز کروائی گئی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ مسئلہ صرف بلوچستان میں نہیں پوری دنیا میں پھیلا نظر آتا ہے۔ ہر طرف فرقہ بندیاں، نسلی ولسانی اختلافات کثرت سے موجود ہیں۔ جب کہ کوئی مذہب نہیں سکھاتا کہ آپس میں بیر رکھا جائے۔

آغا گل کے بیشتر افسانوں میں دشت وجبل ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار علی دوست جس کی دیرینہ خواہش ہے کہ شہر میں شیشے کے دروازوں والی دوکان ہو۔ بالا آخر اس کی خواہش پوری ہوگئی لیکن دوکان کے نام پر تنازعہ شروع ہو گیا۔ علی دوست نے جب کرائے پر شہر میں دوکان حاصل کر لی۔ اور بورڈ بھی آویزاں کر دیا۔ ''علی پرچون اسٹور'' چند نوجوانوں نے اس کی دوکان پر پتھراؤ کیا۔ سبز جھنڈوں والے گزرتے تو بورڈ دیکھ کر نعرہ بازی کرتے۔

دوکان کا نام بدل کر اپنے بیٹے کے نام پر رکھ دیا ''عمر پرچون اسٹور'' پھر سیاہ جھنڈیوں والے بگڑ بیٹھے۔ پھر اس نے ''خان پرچون اسٹور'' نام رکھ دیا لوگوں نے پشتون سمجھ کر کچھ دوری اختیار کر لی۔ گھبرا کر نام ''میر پرچون اسٹور'' رکھ لیا۔ علی دوست کی دوکان کو کسی میر صاحب کی دوکان سمجھ کر نقصان پہنچا دیا۔ بورڈ اتارنے پر اسے ٹیکس والوں نے دھر لیا۔ افسانہ نگار نے براہوی ثقافت اور رسم ورواج کی عکاسی بہت عمدہ انداز میں کی لکھتے ہیں کہ

> ''علی دوست کے آبائی گاؤں دشت گونڈین میں اس کی پرچون کی چھوٹی سی دوکان تھی۔ اور تمام گاؤں والے جانتے تھے کہ کسی کی دوکان ہے براہوی کبھی دوکان پر بورڈ نہیں لگاتے، رواج کے مطابق بورڈ نہیں لگے تھے۔۔۔۔'' (۹۳)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ

> '' براہوی طبعاً سچ بولتے ہیں۔ کند ہم جنس پرواز براہوی بافاختہ زمانہ نہ باز'' (۹۴)

کوئٹہ مصنف کا پسندیدہ شہر ہے، اور اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اپنے افسانہ ''سرلک'' میں انہوں نے کوئٹہ شہر کی منظر کشی

عمدہ انداز میں کی ہے۔ شہری اور دیہاتی زندگی کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کوئٹہ شہر دشت گونڈین سے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے شہر کے باسیوں نے دھویں اور پولوشن کا ایک پیالہ شہر کے گرد الٹا رکھا ہو۔ سارے سیاسی لیڈر، سارے بیوروکریٹ، اسی دھوئیں کے شہر کوئٹہ میں رہتے ہیں۔ سارے سیاستدان اور بیوروکریٹ یہ پولیوٹڈ شہر چھوڑ کر صاف ستھرے قصبوں میں آجائیں۔

انسان اور سرکک میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں لکیر کے فقیر ہیں مصنف کے نزدیک ہماری اپنی کچھ سمجھ بوجھ نہیں۔ اپنے اپنے خول میں منہ دیئے چپ چاپ چلے جارہے ہیں۔ زندگی کے دشت وجبل میں کہاں جانا ہے؟ کیا کرنا ہے کچھ علم نہیں؟ نہ منزل، نہ راستے نہ کوئی ارتقاء، جہاں موڑ دیں موڑ گئے سرکک کبھی زادِراہ نہیں لیتا بس خول ہی اوڑھنا بچھونا ہے۔ آسمان پر سرکک نظر دوڑا نہیں سکتا۔ ہم گردن اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تو سر قلم کر دیئے جاتے ہیں۔

افسانہ زندگی کی حقیقتوں کا ڈرامائی اظہار ہے۔ اور یہ زمین سے جڑے رہنے اور اپنے اردگرد کے کرداروں سے آگاہ رہے۔ بغیر ممکن نہیں جو ہمیں آغا گل کے ہاں نظر آتا ہے۔ ایک ایسے سچے ادیب جو عموماً افسانوں اور ناولوں کے مرکزی خیال زندگی میں پیش آنے والے واقعات یا مشاہدات سے لیتے ہیں۔ اور پھر اس کا فنکارانہ کمال نہ صرف عمدہ انداز کی نسبت ہے جس منظر نگاری، کردار نگاری۔ اور مکالموں کی خوبصورتی، برجستگی، تجسس، جذبات واحساسات کے حوالوں سے مدوجزر کی کیفیات اور ان سب کی آمیزش کے ساتھ آغا گل کی وہ انفرادیت جھلکتی ہے جو بلوچستان کا خاصا اعزاز ہے۔

گوانکو:

''گوانکو'' آغا گل کے تیسرے افسانوی مجموعے کا نام ہے۔ اور اس نام سے ایک افسانہ بھی شامل ہے۔ ''گوانکو'' کے انتساب سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف افسانہ نگاری میں کرشن چندر کے ثناء خواں معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان ہی کی طرح رومانویت اور مزاح نگاری کے پرستار ہیں۔ مزاحیہ افسانے لکھنے کی تحریک انہیں ایک نیم مزاحیہ

افسانہ لکھ کر لی جس کو پڑھ کر ان کے دوستوں نے انہیں مزاحیہ افسانے لکھنے کا مشورہ دیا۔ بقول مصنف سچ لکھنے سے مزاحیہ لکھنا زیادہ بہتر ہے۔ افسانہ نگار میں نہ تو سچ لکھنے کی مت نہ جھوٹ لکھنے کا یارا۔ اکبر آلہ آبادی کی طرح مزاحیہ نگاری آغا گل کی پیشہ وارانہ مجبوری ہے۔ کیونکہ نہ تو وہ اچھی سرکاری نوکری کھونا چاہیں گے اور نہ ہی اپنے ضمیر کی آواز ''گوانگو'' کے حوالے کرنا چاہیں گے۔ اس لیے انہوں نے درمیانی راہ اختیار کی۔

اس مجموعے میں تیرہ افسانے ہیں جن میں اکثر و بیشتر ڈاک کے محکمے اور ڈاک کے ملازمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے انقلاب، ڈریکولا، ڈاک پہ ڈاکہ اور حجامت، بوانئو، گوانگو شامل ہیں۔ ڈاک خانے کی زندگی سے ہٹ کر بھی اس مجموعے میں کئی عمدہ افسانے ہیں۔

پہلا افسانہ ''فدوا'' ہے۔ ایک جاہل گنوار آدمی کی کہانی ہے جو معاشقوں اور جوئے کی وجہ سے بدنام زمانہ ہے۔ فدوا کو پہلا عشق ایک چٹوری سے ہوا جسے حلیم کھانے کا شوق تھا۔ اس کیبگلی میں آوازیں لگاتا، حلیم اے تازہ حلیم اے، فدوا کا دل چاہتا ایسی حلیم بنانے کہ ریڑھی ہتھی پکڑے وہ قتالہ ساتھ چلی آئے۔ دوسرے معاشقوں کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں کہ اس نے گرلز سکول کے قریب دوکان کھولی اور وہاں عشق و عاشقی کا رویہ حسب معمول اپنالیا۔ اور اس عشق کے ڈنکے چار سو بجے کہ سزا کے طور پر علاقہ چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ اسے نظاروں کی طلب بڑھی تو وہ پردہ نصف حصے، میں تان دیا۔ کمال مہارت سے ڈرل مشین سے سکول کی جانب سوراخ کیے۔ دل کے آئینہ میں تصویر یار، جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لیا۔ جو دوست اس حالتِ نظارہ میں پکڑ لیتے زبان بندی کے لیے ایک سوراخ مزید اس دیوار میں ان کے قد کے موافق بنا دیا جاتا۔ میونسپل افسر فدوا سے کرایہ لینے آیا پردہ ہٹایا تو ساکت و جامد رہ گیا۔ اس سے قبل فدوا پر حملہ ہوتا موٹے شیشے والی عینک لگا کر بھاگ گیا۔

فدوا جاہل گنوار ہونے کے باوجود بلوچستان جیسے فراموش علاقے میں ترقی کے زینے طے کرتا رہا۔ اس کردار کے ذریعے مرکزی حکومت، افسران بالا طنز کرتے ہوئے آغا گل لکھتے ہیں کہ بلوچستان میں حالات اس قدر خراب تھے اساتذہ

دوردراز علاقوں سے تعینات کیے گئے جو کسی طور اساتذہ کہلانے کے قابل نہیں تھے۔فدوا جوان پڑھ شخص ہے اور اس کے والد اسے ملازمت کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔

بقول مصنف:

''میری تعلیم تو کچھ بھی نہیں آتا جاتا بھی نہیں، ارے جا پھر بلوچستان میں ماسٹر لگ جا۔۔۔۔خوش قسمتی سے اچانک مرکزی حکومت کو الہام ہوا کہ بلوچستان میں جہالت بہت ہے۔سکول نہیں ہیں، نہ ہی تعلیم۔۔۔۔۔ یہ انکشاف پچیس تیس برس بعد اچانک ہوا تھا۔۔۔۔۔دھڑا دھڑ بھرتی کر لیے جائیں۔۔'' (۹۵)

اساتذہ کی بھرتی کے لیے جو شرائط محکمہ تعلیم اور حکومت نے رکھیں وہ درجہ بالا صورت حال کو مدنظر رکھ کر دی گئیں۔چونکہ ٹیچر مل نہیں رہے تھے۔شرائط ملازمت میں نرمی کر دی گئی۔اول تو پڑھے لکھے ٹیچر آئیں گے نہیں اگر آئے بھی تو رسہ تڑوا کر بھاگ نکلیں گے۔یوں بھی جاہلوں کو پڑھانا ہے زیادہ تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔اس ضمن میں ایک جگہ مصنف لکھتے ہیں:

''عام آدمی تو ان بنجر ویران علاقوں سے بھاگ نکلے گا، علم کیسے پھیلے گا۔۔۔آخر بلوچستان بھی تو پاکستان کا حصہ ہے۔۔۔۔مسٹر فدوا تمہیں منتخب کر لیا گیا ہے اب پوری دلجمعی سے بلوچستان میں علم پھیلا۔۔۔'' (۹٦)

مصنف کے افسانے میں فوجی حکومتوں، ویجی لینس کارروائیوں اور شجاعت پر بھی طنز کے نشتر چلائے ہیں۔مثلاً فوج چلتی پھرتی چیز کو سلوٹ کرتی ہے اور ہر ٹھہری ہوئی چیز پر چونا پھیرتی ہے۔چیزوں پر چونا پھیرنا فوج کی روایت ہے۔اس افسانے ''فدوا'' میں آغا گل نے بلوچستان کی حالتِ زار پر بھی کئی تبصرے کیے ہیں۔مثلاً بلوچستان میں پائی جانے والی رسم ولور جوان کی ثقافت میں قدیم زمانہ سے چلی آ رہی ہے۔اور اب بھی نبھائی جاتی ہے۔آغا گل نے متعدد افسانوں میں

اس رسم کا ذکر کیا ہے۔ ولور سے مراد وہ رقم جو شادی کے لیے دلہن کے والد یا بھائی کو ادا کی جاتی ہے۔
اسی طرح بلوچستان کے نام ہی کچھ ایسے ہیں کہ محض نام ہی کچھ ایسے ہیں کہ محض نام لینے سے ہی عام آدمی کا جبڑا اتر جائے۔ جیسے کہ گلنگور، ورینگر، ژڑخو، وغیرہ۔

فدوا کا کردار سرشار کے خوجی کی یاد دلاتا ہے۔ وہ اتنا ہنساتا ہے کہ بلڈ پریشر ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اکثر جوا کھیلتا ہے، بکریاں چراتا ہے۔ فرضی مسجدوں کے لیے چندہ وصول کرتا ہے۔ مثلاً افسانے میں سکولوں میں چھاپے پڑ رہے تھے۔ حاضری دیکھی جا رہی تھے۔ فدوا خوش قسمت تھا۔ بچ نکلا۔ اس روز محض اتفاقاً وہ ٹیچرز سے چندہ برائے مسجد مانگنے پہنچا ہوا تھا۔ وہ اتنا ادھار لے چکا تھا۔ کہ کوئی اسے ادھار نہ دیتا۔ وہ جس قدر بھی دردناک کہانی سنا ڈالے۔ وہ مسجدوں کے لیے چندہ وصول کیا کرتا جس سے گزر اوقات ہوتی۔ افسانہ نگار کی زندگی کا بیشتر حصہ ڈاک کے محکمے میں گزرا۔ اس لیے یہ محکمہ ان کی سانسوں میں رچا بسا ہوا ہے۔

''دیپک بدکی'' آغا گل کے افسانوں کے حوالے سے ماہنامہ ''سیپ'' میں لکھتے ہیں کہ ان کے افسانوں کو پڑھ کے مجھے اپنے یہاں کے ڈاک کے محکمے کی یاد آتی رہی ہے۔ نام اور مقامات بدل جائیں تو ایسے لگے گا جیسے ہندوستانی ڈاک خانوں کی بات ہو رہی ہو۔ آخر کیوں نہ ہو دونوں ایک ہی نوآبادیاتی نظام کی دین ہیں، دونوں کے طور طریق یکساں ہیں۔ آزادی کے بعد کئی تبدیلیاں لانے کی کوششیں کی گئیں مگر یہ محض لیپا پوتی Cosmtic changes تک محدود ہیں۔ بنیادی ڈھانچہ آج بھی جوں کا توں کھڑا ہے۔

آغا گل نے اپنے افسانے ''ڈریکولا'' کے ذریعے ڈاک خانے، اس کے ماحول، ملازمین پر طنز کے خوب نشتر چلائے ہیں۔ ڈاکخانے کے مزاج میں آزادی شامل ہے، پابندیوں یا قانون کا عمل دخل انہیں کھلتا ہے۔ برداشت ہی نہیں کر سکتے یہاں وہ شاھین بھرے پڑے ہیں جو صرف ڈاکخانے میں ہی گزارہ کر سکتے ہیں۔ مصنف ڈاکخانے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''تمام خواتین، ہسپتال، تمام تھانے، اور تما ڈاکخانے ایک جیسے

ہوا کرتے ہیں۔۔۔۔۔'' (۹۷)

دوردراز علاقے میں تعینات ہونے والے پوسٹ ماسٹر جسے تربیت کے لیے اس بھیجا جاتا ہے۔ مصنف نے اس کے ساتھ پیش آنے والے حالات کو قلم بند کیا ہے۔ کہ کیسے رات کے وقت عجیب وغریب آوازیں سنائی دیا کرتیں۔ جیسے بہت سے لوگ اکٹھے چلے آرہے ہوں۔ دروازوں پر دستک ہوتی۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی زمانے میں یہاں قبرستان ہوا کرتا تھا۔ ڈاک خانے کی زمین پر دراصل پہلے قبرستان تھا۔ یہ جگہ بھاری ہے، آپ حوصلے سے رہیں۔

آغا گل اپنے علاقائی کلچر کے نمائندہ سفیر ہیں۔ ان کے افسانوں میں بلوچستان کی بوباس ملتی ہے۔ اپنے علاقے کے لوگوں سے شدید محبت پائی جاتی ہے۔ مگر اس کو علاقائیت سے تعبیر دینا صحیح نہیں بلکہ اس لفظ میں منفی پہلو جلوہ گر ہے۔ اپنے علاقے کے لوگوں سے محبت ان کے مزاج کا خاصا ہے۔ اپنے لوگوں سے اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ اس ضمن میں اپنے افسانے ''ڈریکولا'' میں لکھتے ہیں

''ایک روز معلوم ہوا کہ ہمارے علاقے کا ایک شخص اکرم کسمپرسی کے دن

گزار رہا تھا، میرے دوست صدیق کا بہنوئی بھی تھا۔ میں نے کوئٹہ فون کیا

اور صدیق سے کہا اپنے بہنوئی کو ہدایت کرے کہ فوری طور پر مجھ سے رابطہ

کرے، ضروری کام کرے۔۔۔'' (۹۸)

اسی ضمن میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ

''مزاج میں سخاوت ہے مل کر بانٹ کر کھانے کی عادت ہے۔۔۔۔

بلوچستان میں۔۔۔ بانٹنے کا رواج عام ہے مل بانٹ کر کھاتے پیتے

ہیں۔۔۔۔'' (۹۹)

مصنف نے افسانے ''ڈریکولا'' میں بلوچستان میں بولی جانے والی مشکل اردو زبان کے بارے میں رقم کیا ہے:

''چوکیدار نے لفظوں میں نقشہ کشی کی ترچھی آنکھیں تھیں، چھریرا بدن، مجھے
سخت ناگوار گزرا، چھریرا کے بچے آسان اردو میں بات کرو، میں کویٹہ
وال ہوں'' (۱۰۰)

آغا گل طنز و مزاح کے میدان میں بھی اپنی انفرادیت کی مہر ثبت کرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ان کا افسانہ ''رموزِ زباں'' کی بہترین مثال ہے۔اس افسانے میں افسانہ نگار نے دوستوں جو کہ بلوچستان کے دور افتادہ دیہات سے شہر میں تعلیم حاصل کرنے اور بہترین مستقبل کے لیے آتے ہیں۔پڑھائی کرنے کے بعد ان کو ایک پرائیوٹ سکول جس کی پرنسپل مسز خان ہوتی تھی انہیں ملازمت مل گئی۔مسز خان مزاجاً بہت سخت خاتون واقع ہوتی ہے۔لیکن مجبوری میں وہ یہ نوکری کرتے ہیں۔کیوں کہ اگر واپس گاؤں جائیں وہاں بابا کے ساتھ ریوڑ ہانکتے، حقہ پیتے اور گئے وقتوں کی کہانیاں سنا کرتے، گاؤں میں ذلیل ہونے سے بہتر تھا۔مسز خان کی کڑوی کسیلی باتیں سن لی جائیں اور ویسے بھی اگر گاؤں میں روٹی ہوتی تو شہر کا رخ کیوں کرتے۔

بلوچستان کے دیہات میں چونکہ ملازمت کے مواقع بہت کم ہیں۔اس لیے وہ دونوں بہترین مستقبل کے لیے فکر مند تھے۔جس سے ان کے مزاج میں خود غرضی کا عنصر غالب نظر آرہا تھا۔''رموزِ زباں'' کا راوی اپنے دوست سلیمان جو کہ پرنسپل کی بیٹی کنول پر ڈورے ڈالتا ہے۔تا کہ وہ مسز خان کی جائیداد ہتھیا سکے۔اس کی Future planning تھی۔کہ وہ کنول سے شادی کر کے سکول کا مالک بن جائے گا۔اور مسز خان کی گارنٹی کسی سیاسی حکومت کی طرح کم تھی، امکان تھا چند برس بعد از خود چلتی بنے گی۔بڑھیا کی دولت سے کوئی مناسب کام کروں گا۔یہ سکول چلانا، یتیم خانہ چلانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

''رموزِ زباں'' اس افسانے کا راوی اردو زبان بولنے میں بہت کمزور ہوتا ہے۔یہ مسئلہ ہمیشہ سے مقامی زبانیں بولنے والوں کا رہا ہے۔اردو کا علم نہ ہونے کے باعث وہ دفتری اوقات کے بعد ایک معلم عبدالحق رنجور سے اردو سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔مگر مسز خان اسکی زباب دانی سے خوش نہیں بلکہ حد درجہ خائف رہتی تھیں۔افسانہ نگار اس صورت حال کے

بارے میں لکھتا ہے۔

''مسز خان نے ہلکا پھلکا کا امتحان لیا۔۔۔یہ فقرہ درست کرو'' ہمارا اماں بیمار ہو کر مر گیا۔۔۔۔میں نے جھٹ فقرہ درست کیا ہمارا اماں بیمار ہو کر مر گیا،تم اردو پڑھاؤ گے؟ مونث مذکر تمہیں آتا نہیں ہمارے ہاں مونث مذکر کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔۔۔۔نکل جاؤ میرے دفتر سے گستاخ،جنگلی، بدتمیز۔۔۔'' (۱۰۱)

راوی اردو سیکھنے کے باوجود مونث مذکر کا فرق نہیں سمجھ سکا۔تنگ آ کر وہ اپنے استاد محترم عبدالحق رنجور سے پوچھتا ہے کہ یہ کیسی اردو ہے جس میں مرد کی داڑھی مونث اور عورت کا ڈوپٹہ مذکر ہے۔اس زبان میں اتنا بڑا تضاد کیوں ہے۔وہ اسے سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''وقت لگے گا ہم پچھتر برہونے کو آئے اب تک اردو کی باریکیوں کو نہیں سمجھ پائے۔۔۔۔استاد بے بسی سے بولے'' کوئی براہوی میں اردو بولتا ہے۔سات کروڑ انسان پنجابی میں اردو بولتے ہیں۔اردو میں کوئی اردو نہیں بولتا۔جی چاہتا ہے منہ لپیٹ کر بلوچستان سے چلتا بنوں۔بڑی کوفت ہوتی ہے۔۔'' (۱۰۲)

درجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے اردو دان طبقے پر بھرپور اور لطیف انداز میں طنز کیا ہے۔انہوں نے اپنے افسانے ''رموز زبان'' میں سیاست پر بھی طنز کے کڑوے کسیلے نشتر چلائے ہیں۔مثلاً سکول میں ان کے پرامن زندگی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ کھانا بھی اچھا تھا،بجلی،پانی بھی مفت،کبھی کبھی یوں لگتا میں حساس ادارے کی امداد پر پلنے والا سیاستدان ہوں۔

مصنف نے بلوچستان کے جغرافیائی ماحول کے حوالے سے ''رموز زباں'' افسانے میں لکھا کہ وہاں بارش کم ہوتی ہے۔اگر ہو تو وہاں کے مکین اس موسم کو بہت انجوئے کرتے ہیں۔اور ایسے میں اگر کبھی کبھار کوئی افسر سالانہ معائنہ

کے لیے آجائے تو حسب دستور سارا کریڈٹ اس کو دے دیا جاتا ہے۔

افسانوی مجموعہ ''گوانگو'' میں بیشتر افسانے محکمہ ڈاک سے متعلق ہیں۔ان میں ایک افسانہ ''انقلاب'' ہے۔مصنف نے ڈاکخانے کے ماحول کی بہت دلچسپ انداز میں عکاسی کی ہے۔ڈاک خانے کے ماحول اور کارکردگی سے متعلق انہوں نے تاریخی حوالے بھی دیئے ہیں۔مثلاً ابن بطوطہ اگر چہ پوسٹ ماسٹر نہیں تھا۔مگر محکمہ ڈاک کی کارگزاری کے بارے میں اس نے اپنے سفرنامے میں تحریر کیا ہے کہ ملتان سے سات روز میں خطوط دہلی پہنچ جایا کرتے تھے۔کتنے انقلاب آئے مرہٹے،مغل،فرانسیسی،انگریز کتنے ہی حالم بدلےمگر ڈاکخانے کا معیار برقرار رہا۔''انقلاب'' میں افسانہ نگار نے ڈاکخانے کے منتظمین اور ملازمین کی ذہنیت پر بھرپور وار کیا ہے۔کہ کنڈیشنگ کے باعث ان پر بدبودار ماحول غلیظ ماحول کا کوئی منفی اثر نہیں ہوتا۔مثلاً افسانے میں جو دروازہ سٹاف واش روم کا ہال میں کھلتا ہے،اس نے قیامت ڈھار کھی ہے،شاید نفس کشی کے لیے یہ ماحول بنا رکھا تھا۔پوسٹ ماسٹر نے موقعہ واردات کا معائنہ کیا۔جو جائے حادثہ بھی بن سکتی تھی۔مگر زندہ بچ نکلا۔چند احکامات کو موقعہ پر ہی جاری کر دیئے۔ان کا نفاذ بھی فوری کروایا۔پانی کا کنکشن دلوایا،صابن رکھے،تولیے رکھے۔آئینہ لگوایا،کنگھے برش بھی رکھ۔مسلمان تو لوٹے کے بغیر نہیں رہتا۔لوٹا بھی رکھوادیا۔سب انتظامات کروا کے دینے کے بعد واش روم کا تمام سامان تین بار چوری ہوا۔ہر بار نیا سامان منگوایا جاتا۔لیکن مسلسل تحقیق کے بعد یہ نتائج سامنے آئے کہ ڈاکخانے کے ملازمین اس گندے ماحول کے عادی تھے۔اور انہوں نے خود ہی واش روم کا سامان چوری کیا۔اور گھروں میں لے گئے۔بہر حال ڈاکخانے کی صارفی خاتون پوسٹ ماسٹر سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ڈاکخانے کی بدبو اور سڑاند کا تدارک کرے،پوسٹ ماسٹر نے کہا محترمہ آپ بےفکر رہیں میں ڈاک خانے کو عرق گلاب سے دھلوادوں گا۔صفائی کی عمل آوری میں پوسٹ ماسٹر اپنے سٹاف اور لیڈر یونینز کے عتاب کا شکار ہو جاتا ہے۔کیونکہ وہ آڈر دیتا ہے کہ واش روم کا متعلقہ جملہ سامان اب زنجیروں سے باندھ کر رکھ دیا جائے۔تا کہ کوئی چوری نہ کر سکے۔لیکن یہ بھی محض خام خیالی ثابت ہوئی۔مصنف یونینز حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''نوب یونین،فوپ یونین،کریکل یونین،پوسٹ مین یونین،ریلوے یونین
سروس یونین،ڈرائیور یونین،چوکیدار یونین،یونیفارم یونین،سٹاف یونین۔

۔۔۔۔جس طرح چیونٹیاں اپنے وزن سے ستر گناہ زیادہ وزن اٹھا سکتی ہیں ڈاخانہ
بھی اپنی جسامت سے کہیں بڑی یونینز کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے'' (۱۰۳)

جب سب یونینز والے پوسٹ ماسٹر کے خلاف اکٹھا ہو گئے اور نعرے بازی کرنے لگے۔ ایسے میں ڈپٹی پوسٹ ماسٹر کو مشورہ دیتا ہے کہ میں آپ کی جان چھڑوا سکتا ہوں۔ اگر آپ وعدہ کریں۔ کہ آپ آئندہ کسی لیڈی Complainants سے نہیں ملیں گے۔ پوسٹ ماسٹر چونکہ صفائی کروانے کے لیے ہزاروں بار کوششیں کر کے تھک چکا ہوتا ہے۔ آخر کار تائب ہو کر یوں کہتا ہے کہ

''ٹھیک ہے ڈپٹی صاحب! میں کوئی انقلاب لانے کی کوشش نہیں کروں گا۔
آج کے ہنگامے میں اگر زندہ بچا تو نہیں ملوں گا'' (۱۰۴)

آغا گل کا افسانہ ''کوئٹہ میں ہاتھی'' بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے۔ اس افسانے میں بلوچستان کی معاشرت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ مصنف نے کوئٹہ میں لگنے والے میلہ بہاراں کا بہت دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔ جو لوگوں کے لیے تفریح اور خوشی کا باعث بنتا ہے۔ میلہ بہاراں میں کھیل تماشا، کھانے، پینے کے سٹال تھے۔ جوئے کے سٹال تھے مگر سب سے زیادہ دلچسپی سرکس پر مرکوز تھی۔ بلوچستان میں میلہ بہار کے بعد لگایا جاتا ہے۔ کیونکہ بلوچستان میں تو اپریل میں ہی رخصت ہو جایا کرتی ہے۔

مصنف موسم بہار اور موجودہ نظام پر افسانے میں چند ایک جگہوں پر طنزیہ پیرائے میں اظہار خیال کرتے ہیں:

''کوئٹہ کی بہار بھی سردیوں کی چاندنی اور غریب کی جوانی کی طرح
چپکے سے گزر جاتی ہے۔ مارچ میں آتی ہے اور اپریل کے دوسرے
ہفتے کسی سیاسی حکومت کی طرح چپکے سے منہ لپیٹ کے چلی جاتی ہے'' (۱۰۵)

ہاتھی اور شیر یا صدر پاکستان کبھی کبھار آیا کرتے تو لوگ بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھا کرتے، تالیاں پیٹتے، خوشیاں مناتے۔ اس افسانے میں مصنف نے جہاں میلہ بہاراں اس کے ماحول کی عکاسی کی ہے، وہیں انہوں نے ظہور پذیر

ہونے والے واقعات کو بھی درج کیا ہے۔کوئٹہ جیسے دورافتادہ علاقے میں جب کبھی سرکس یا ہاتھی آجاتے تو لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بن جاتے ہیں لوگ جوق در جوق انہیں دیکھنے چلے آتے ہیں۔

ایسی جگہ معصوم اور جلدی یقین کرنیوالے لوگ رہتے ہیں جب یہ خبر پھیل جاتی ہت کہ ہاتھی نے کسی گونگے کا بچہ کھالیا ہے اور گونگا بیچارا اشاروں سے واویلا مچا رہا ہے۔ماحول میں چاروحشت پھیلی ہوئی تھی۔کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ ہاتھی سبزی خور جانور ہے گوشت خور نہیں۔پولیس بھی حرکت میں آجاتی ہے۔اور نہ صرف ہاتھی بلکہ سرکس کے مالک کو بھی موردالزام ٹھہراتی ہے۔آغا گل اس تمام صورتحال کو بلوچستان کے مخصوص علاقے میں بسنے والے عوام کی ذہنی سطح سوچ اور فکر کے پسِ منظر میں دیکھتے ہیں۔

> ''شور مچا کہ ہاتھی گونگے کا بچہ کھا گیا سبھی مضطرب ہو گئے کہ کیا کیا جائے۔۔۔ اکثریت کی رائے تھی کہ ہاتھی کو زمین پر گرا کر اس کا پیٹ چاک کرکے بچہ نکال لیا جائے۔۔۔۔جو جا قو ہاتھ لگا، جو چھری ملی اٹھالائے۔۔۔۔سرکس کا مالک۔۔۔۔ چیخ چیخ کر پکارنے لگا، میرا ہاتھی آدم خور نہیں ہے کوئٹہ والوں کو اپنا بھائی سمجھتا ہے۔۔۔۔بھلا انہیں کیسے کھائے گا، مجمع دانش وروں سے خالی نہ تھا، کھایا نہیں نگل گیا ہے۔۔۔۔عقل کے اندھو ہاتھی سبزی خور جانور ہے کبھی ہاتھی کو کڑھائی گوشت کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔۔۔۔ہاتھی کبھی گوشت نہیں کھاتا۔۔۔'' (۱۰۶)

آخر شیر کے پنجرے کے باہر تماشا دیکھتے ہوئے بچہ مل گیا، اور معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔

''دیپک بدکی'' ''کوئٹہ میں ہاتھی'' کے حوالے سے لکھتے ہیں۔''کوئٹہ میں ہاتھی'' پڑھ کر مجھے ایک کشمیری قصے کی یاد آئی جو سر والٹر لارنس نے ویلی آف کشمیر میں بیان کی ہے۔کہ کشمیری لوگ افواہیں پھیلانے اور ان سے متاثر ہونے میں ماہر ہیں۔اگر کوئی شخص صرف یہ کہتے ہوئے بھاگتا رہے ''گیہ ہو گیہ'' ہو گیا ہو گیا۔تو لوگ جوق در جوق اس راستہ کے پیچھے بنا کچھ کہے سنے بھاگنے لگیں گے۔آخر کار بہت راستہ طے کرنے کے بعد اگر کوئی اس سے پوچھ بیٹھے کہ بھائی یہ تو بتاؤ ہوا کیا ہے؟ تو جواب ملے گا کہ زینہ گدل (پل) سے کسی نے جہلم دریا میں تھوک گرادی اور وہ بہہ گئی کچھ اس طرح کا واقعہ آغا گل

کے افسانے میں نظر آتا ہے۔انہوں نے افسانہ ''کوئٹہ میں ہاتھی'' میں بہت عمدہ اور خوبصورت طریقےسے عوام کی سادہ ذہنیت کی خندہ آور انداز میں عکاسی کی ہے۔

افسانے ''ڈاک پہ ڈاکہ'' میں آغا گل نے بلوچستان میں ناقص ڈاک کے نظام کا احوال قلم بند کیا ہے۔بلوچستان کے دور افتادہ ولاقوں میں ڈاک ناقص زرائع آمدورفت کے زریعے تقسیم ہوتی ہے۔جس سے ڈاک پہنچنے میں کافی تاخیر ہو جاتی ہے۔وہ ڈاک جو ایک دن میں پہنچائی جا سکتی ہے اسے پانچ روز میں پہنچایا جاتا ہت۔کیونکہ (Mail routes) پر کنٹریکٹروں کی اجارہ داری ختم کرنا دل گردے کا کام ہوتا ہے۔خاص کر دور دراز علاقوں میں جہاں کنٹریکٹر میل لانے اور لے جانے کو اپنی برتری کی علامت گردانتے ہوں۔مصنف اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> ''ڈاکخانے کے کسی افسر کی ہمت نہ پڑتی کہ میل کنٹریکٹر کسی اور کو دینے کا سوچ سکتے، بس شاید اکرم کو بسیں پیدائش پہ تحفے میں ملی ہوں اس کی ہم عمر تھیں۔۔۔۔'' (۱۰۷)

اکرم کو جب بھی ڈاک کے حوالے سے کچھ کہا جاتا تھا تو فوراً کہتا تھا کہ یہ ڈاک میرے دادا کو انگریزوں نے مرحمت فرمائی تھی۔انگریزوں کی عطا کردہ کوئی چیز واپس نہیں ہوسکتی سرداری نہ نوابی حتیٰ کہ ان کے جاسوس خاندان بھی وہی ہیں تو مجھ سے میری ڈاک کیسے چھینی جا سکتی ہے۔افسانہ ''ڈاک پہ ڈاکہ'' میں پی ایم جی کی شہ پا کر جب راوی میل کنٹریکٹر بدلنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ کنٹریکٹر جو آپس میں چچا، بھتیجا ہوتے ہیں۔ایک دوسرے سے گتھ جاتے ہیں۔گولیاں چلتی ہیں۔اور منظر کو ملتا ہے۔کرم کا کوچ ڈاک لیے جا رہا تھا آگے آگے اور اس کے تعاقب میں اکرم منزلیں مارتا بڑھ رہا تھا۔جانثار بھی اسلحہ لہرا لہرا کر نعرہ بازی کرنے لگے۔ڈاک ہماری ہے، لے کر رہیں گے۔ڈاک، غاصبو جواب دو، ڈاک کا حساب دو، فائر کے بعد کچھ گنجائش ہی نہ بچی تھی، دونوں جانب سے چاند، مشتری پر فائر ہونے لگے۔لوگ کوچ کی چھت پہ چڑھ کر رسیاں کترنے لگے، کچھ ڈاک کے تھیلے بندشوں سے آزاد کرنے لگے۔تو بعض دوبارہ باندھنے لگے، پارسل بکھر گئے خط ہوا میں اڑنے لگے۔افسانہ نگار اس منظر کو دیکھ کر کہیں کہیں جا نکلتا ہے۔

''ڈاک کے تھیلے کسی کمزور ملک کے آئین کی طرح طاقتوروں کے ہاتھوں

اچھلنے پھدکنے لگے، گھمسان کا رن پڑا۔۔۔'' (۱۰۸)

لڑائی اس قدر بڑھی اور نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ معاملہ پولیس تک چلا گیا۔ اور وہاں قبائلی دستور کے مطابق قبیلے کے سرکردہ معززین علاقہ اور دیگر افراد اکٹھے ہو گئے۔ کیونکہ بلوچستان کی ثقافت میں یہ شامل ہے کہ جب ایک قبیلے کے افراد آپس میں یا کسی دوسرے قبیلے سے الجھ پڑیں تو دونوں طرف قبائل کے سربراہ اور معززین ان مسائل کو سلجھاتے ہیں۔

''معززین علاقہ کو جب خبر ملی دوڑے چلے آئے۔۔۔ دنبہ ذبح کیا گیا کھانا

پکنے لگا۔۔۔۔۔ سبز چائے اور خشک میوہ جات سے تواضع کیا جانے لگی۔۔

۔۔۔۔۔ قبائلی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے لگے، علماء اور سردار خیل

بھی آپس صلح آشتی کی باتیں کرنے لگے۔۔۔۔ سب کے سمجھانے پہ کرم نے

چچا سے معذرت طلب کر لی۔ چچا نے بھی دست شفقت سے نوازا۔۔۔ معاملہ

رفع دفع ہوا قبائلی ضمانت پر رہا ہو کر چلتے بنے۔۔۔'' (۱۰۹)

افسانہ نگار نے افسانہ ''ڈاک پہ ڈاکہ'' میں بلوچستان کی تہذیب وثقافت کے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے کہ کتنے سنگین حالات دونوں طرف پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بلوچستان میں رشتوں کا احترام لازم سمجھا جاتا ہے۔ رشتوں کا تقدس پامال نہیں کیا جاتا چاہے جان سے ہی ہاتھ کیوں نہ دھونا پڑیں۔:

''سارے جنگجو ایک ہی گھرانے سے تھے لہٰذا آپس میں احترام کا رشتہ

برقرار رکھا۔۔۔۔۔ دھول دھپہ لپاڈگی نہ ہوئی۔۔۔ مگر یہ التزام رکھا

کہ کسی کو دھکا نہ دیا محض ایک دوسرے کے ہاتھوں سے ڈاک چھین

رہے تھے۔۔۔۔'' (۱۱۰)

انتظامیہ فریقین کرم اور اکرم کو باہمی مفاہمت پر راضی کرواتی ہے۔ دونوں کے درمیان ڈاک کی مساوی بانٹ کر دی جاتی ہے۔ اس طرح دونوں کے توسط سے بلوچستان میں ڈاک تقسیم ہونے لگتی ہے۔ یہ مسئلہ طے پایا کہ ایک روز چچا ڈاک لے

کر جایا کرے گا اور دوسرے روز بھیجا ان میں مساوی رقم بانٹ دی جایا کرے گی۔ پی ایم جی نے اسے غنیمت جانا کبھی تو ڈاک ایک روز میں پہنچا کرے گی اور کبھی پانچ روز میں۔ عجب شتر کر گی ہے۔ خیر شاعری میں بھی اس کی اجازت ہے فی الوقت یہ غنیمت ہے کہ بلوچستان میں ڈاک تقسیم ہو جایا کرے گی کتنے دن لگیں گے یہ نہ سوچا کریں۔

مصنف نے اپنے افسانے میں تاریخی حوالہ بھی درج کیا وہ حالات و واقعات جو ہمارے قائد کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں پیش آئے کہ جب ان کی طبیعت ناساز تھی۔ ایسے میں مفاد پرست سیاستدانوں نے ان کی خرابیِ صحت کا ذرا پاس نہ کیا۔ اور ایسے علاقے میں بھجوا دیا جو تمام طبی سہولتوں سے دور تھا:

''قائداعظم کو تمام انسانوں سے دور تمام طبی سہولتوں سے مبرا ایک وحشت ناک ویرانے میں کہ جسے زیارت کہا جاتا ہے منتقل کر دیا گیا۔۔۔۔۔ وہاں بجلی تک نہ تھی۔۔۔۔۔ اونچی اونچی سڑکوں سے برائے طبی معائنہ کوئٹہ لایا گیا ۔۔۔ تین گھنٹوں کا انتہائی تکلیف دہ سفر۔۔۔ نو گھنٹے میں طے کیا جاتا تھا۔۔۔۔'' (۱۱۱)

افسانہ نگار کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ اپنے اصل موضوع سے ہٹ کر سیاسی یا شخصی حوالوں کو درمیان میں لے آتے ہیں۔ اور ایسے جملے لکھ جاتے ہیں جو قاری کو تادیر کسی اور حالت یا ماحول میں لیے پھرتے ہیں۔

آغا گل کا افسانہ ''غیرتی'' ایک چونکا دینے والا افسانہ ہے۔ معاشرے میں موجود ایسی تلخ حقیقتوں کو آشکار کرتا ہے۔ ایک عام آدمی ان کے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ''گوانگو'' میں موجود مزاحیہ افسانوں میں ''غیرتی'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں المیہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔

''غیرتی'' کہانی ہے ایک ایسے نوجوان کی جو محبت کی شادی کرتا ہے۔ لیکن بعد میں اسی بیوی پر شبہ کرنے لگتا ہے۔ اور قتل کر دیتا ہے۔ مصنف بلوچستان میں موجود ایسی برائیوں کو بے نقاب کرتے ہیں جو اس معاشرے میں باقاعدہ قانون کا درجہ رکھتی ہیں۔ غیرت کے نام پر قتل کرنے والے کو ''غیرتی'' کہا جاتا ہے۔ عزت اور اعلیٰ مرتبے کا متحمل سمجھا جاتا ہے۔

''یہ غیرتی ہے، اب ہمارا ساتھی ہے، ہمارے ساتھ رہے گا، جو مرد خواتین
کو قتل کر کے جیل میں آیا کرتے انہیں ادب واحترام سے قیدی نہیں غیرتی
کہا جاتا۔ قیدی تو چوری چکاری، لوٹ مار کر کے آیا کرتے۔ غیرتی تو وہ بلند
مرتبت انسان تھے جو اپنی ماں، بہن، بیٹی یا ایسے ہی کسی مقدس رشتے کی
خاتون کو اخلاقی گراوٹ کے شک پر قتل کر کے مونچھیں مروڑتے جیل آجایا
کرتے تھے۔ انہیں سزا نسبتاً کم ملا کرتی۔ ظاہر ہے وہ غیرت کے نام پر قتل کیا
کرتے، غیرت تو مردوں کا زیور ہے'' (۱۱۲)

افسانہ نگار آگے چل کر اس افسانے میں مخصوص طنزیہ انداز لکھتا ہے کہ ''غیرتیوں کا اخلاقی معیار بلند ہے۔ جو مقدس رشتے کو زرا سی بات پر کاٹ ڈالے وہ خود کسی قدر اعلی وارفع مرد ہوا کرتے ہیں۔ اس افسانے میں مصنف نے جس غیرتی کا ذکر کیا ہے وہ اپنی بیوی کو زرا سی بات پر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ لیکن اس کے بعد خود جیل میں بیعزتی اور اہانت سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ بہت خوبصورت انسان تھا اور جیل میں موجود غیرتی اس غیرتی کو سد سکندری کی مانند ساتھ لے جانے پر تلے ہوئے تھے۔ اسکا ہر انداز حشر برپا کرنے والا تھا۔ سہ پہر کی سنہری دھوپ میں غیرتی خوب چمک دمک رہا تھا۔ اس افسانہ ''غیرتی'' میں سیاست دانوں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ

''وزیر مشیر دو چار برس بعد جیل یاترا کے لیے بھجوا دیے جاتے تھے۔ کئی سیاسی
زعماء خود ہی التجائیں کرتے کہ انہیں گرفتار کر لیا جائے کیونکہ وہ نہ تو حکومت کے
خلاف تحریک چلا سکتے تھے اور نہ ہی لاتعلق رہ سکتے تھے ان کی مقبولیت کا گراف گر
جائے گا۔۔۔۔۔اے کلاس ملتی، خوب اچھا کھانا، فارغ البالی۔۔۔'' (۱۱۳)

اس افسانے میں طنزیہ انداز تو ہے ہی اس میں ایک تہ نشین قسم کی المناکی کا احساس بھی قاری کو اپنے سحر میں مبتلا رکھتا ہے۔

''ڈاک اور حجامت'' آغا گل کا یہ افسانہ ڈاکخانے سے متعلق ہے۔ یہ کہانی دراصل ایک پوسٹ ماسٹر کی تقلیب ماہیت کی ہے۔ ڈاک خانہ جس مقام پر قائم کیا گیا تھا۔ پہلے ایک حجام کی دوکان تھی۔ وہ بیچ کر پنجاب چلا گیا۔ کیونکہ اندرون

شہر سے ڈاکخانہ مین روڈ پر منتقل کیا گیا تھا۔لورالائی کے بعد یہ پہلا ڈاک خانہ تھا۔ جو دوسو کلومیٹر کے فاصلے پر قائم کیا گیا تھا۔ بیچ میں رہے نام اللہ کا۔ڈاکخانے میں پوسٹ ماسٹر رکھا گیا اس بیچارے کو بندوق کے زور پر ڈاکخانہ چلانے کے بجائے حجام کا کام کرنا پڑا۔ کیونکہ بلوچستان کے آس پاس کے پہاڑوں کے لوگ چلے آتے اور اسے نائی سمجھتے بال بنوانے اور شیو بنوانے کی ضد کرتے۔ دیہات سے آئے ہوئے سادہ لوح لوگ ابھی تک اس جگہ کو حجام کی دوکان سمجھتے تھے۔ شاعرانہ انداز نے اس صورت حال کو مزید مضحک خیز بنا دیا ہے جیسے کہ:

''حجام کا رخ کرتے حالانکہ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل

وہ دوکان اپنی بڑھا گئے'' (۱۱۴)

اس نے بہت سمجھایا کہ وہ پوسٹ ماسٹر ہے لیکن وہ اس کی بات سنتے ہی نہیں تھے۔ کیونکہ بعض کو اردو سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ وہ مقامی زبان میں بات کرتے اور پوسٹ ماسٹر سے بمشکل اردو میں بات کرنے کی ناکام کوششیں کرتے تھے۔ افسانہ نگار کا قلم کس خوبی سے اس صورتحال کی تصویر کشی کرتا ہے۔

''حجامت بنوانی ہے، نائی خانہ کھولو

یہ ڈاکخانہ ہے میں پوسٹ ماسٹر ہوں چلے جاؤ

۔۔۔۔ بھائی اتنی دور جانا ہے، زیادہ پیسے لے لو، ایسے بھی کیا نخرے''

بھائی یہ ڈاکخانہ ہے یا پاگل خانہ ہمیں کیا ہمیں تو حجامت بنوانا ہے

پہاڑوں صحراؤں کے لوگ ہاتھ چھٹ ہوا کرتے ہیں، اس لیے پوسٹ ماسٹر

زیادہ زبان درازی سے اجتناب کرتا'' (۱۱۵)

پوسٹ ماسٹر کو وہ نائی سمجھتے حالانکہ اس نے لاکھوں بار سمجھایا کہ وہ پوسٹ ماسٹر ہے نائی نہیں۔ ایک دفعہ علاقے سے دولڑاکا مزاج لڑکے چلے آئے اور اس سے زبردستی کرنے لگے۔ کہ ابھی بال بنا دو انہیں اردو نہیں آتی تھی، لاکھ سمجھایا کہ

''بھائی میں پوسٹ ماسٹر ہوں، بات بڑھ گی تو ایک نے بولٹ کھنچا

کلاشنکوف اس پر تان دیا، موت کو آنکھوں کے سامنے پا کر اس نے

قینچی کنگھی سنبھال لی ان کی درگت بنانے لگا''　(۱۱۶)

حجامت بنوانا اور ''درگت بنانا'' افسانہ نگار کا کیا خوب صورت انداز ہے۔ جو افسانے میں موجود صورتحال کو خندہ آور بنا دیتا ہے۔ ''درگت بنانا'' خراب لوگوں کو حجامت بنا کر اور بھی خراب بنا دینا، پرلطف تلازمہ ہے۔ بعد میں پوسٹ ماسٹر اس پیشے کو نفع بخش پا کر اپنے افسر کو بھی مشورہ دیتا ہے کہ وہ پہاڑوں میں بیابانوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں اس کے بدلے کوئٹہ میں بڑا سا سیلون کھول لیں۔ آغا گل اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''گستاخی معاف! ایسا نہیں ہوسکتا آپ بڑا سا سیلون کوئٹہ میں کھول لیں
کہاں مارا مارا پہاڑوں۔ بیابانوں میں پھرتے ہیں، روپیہ بھی خاصہ ہے
۔۔۔۔۔۔اور بڑے بڑے سر جھکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔۔''　(۱۱۷)

بال بنوانے کی عیاشی نئی نئی تھی۔ پہلے پہل حجامت بنوانے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ شاذ و نادر لوگ ہی جو بہت شوقین ہوتے، حجامت بنوانے آتے کیوں کہ حجامت بنوانے کے لیے انہیں بہت دور دراز علاقوں کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔ افسانے کا راوی لکھتا ہے کہ میرے والد محترم فرماتے ہیں۔ ''عالم جوانی میں جب کوہلو میں دوستوں کو بال بنوانے کا شوق چڑھتا تو چند ایک دوست کوہلو سے امام ضامن بندھوا کر ڈیرہ غازی خان چلے جایا کرتے بال بنوا کر چند روز میں لوٹ آتے تھے۔ افسانہ نگار نے طنزیہ جملوں کی لہریں جو اس ترتیب دی ہیں۔ مسلسل قاری کو حیرت میں ڈالے رکھتی ہیں

''پنجاب سے حجام گورنر افسر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس لیے
میں کوئی خاص متاثر نہیں''
سرکاری افسروں والی ازلی و ابدی بزدلی اور منافقت اس کے چہرے
سے غائب ہو چکی تھی''　(۱۱۸)

افسانہ ''مجاہد اعظم'' کہانی پن پورا اترتا ہے۔ یہ افسانہ ''مجاہد اعظم'' ایک لڑکے نیکو کی کہانی ہے جو کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ سر چھپانے کو چھت تک اس کے پاس، ملازمت کے ذرائع نہیں ہوتے۔ لیکن نہایت عبادت گزار انسان

ہوتا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات کی سختی اسے برائیوں کی طرف لے جاتی ہے۔نیکو کو تیس برس کی عمر میں کہیں جا کر علم ہوا کہ روپیہ محنت سے نہیں عیاری سے کمایا جایا جاتا ہے۔ورنہ کسان ہزاروں برس سے بھوکے ننگے نہ سویا کرتے۔وہ ہیروئن کے سگریٹ فروخت کرنے لگا۔سماج اس قدر اذیت میں تھا۔کہ کسی ماہر Anesthesist کی مانند اپنے دینی بھائیوں کو زندگی کے ناقابل برداشت کرب سے بچائے رکھتا۔وہ اپنا کاروبار دلجمعی سے کرتا تھا۔اس کے نزدیک یہ غلط کام نہ تھا۔اس کا نظریہ تھا کہ اگر سن کرنے کی دوادی جاسکتی ٹیکہ لگایا جاسکتا ہے۔تو منہ سگریٹ سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔نیکو ہیروئن کے ساتھ ساتھ مسند سے جوتیاں چرانے بھی لگتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے۔پھر بھی اسے خوف رہتا ہے۔کہ کہیں رنگے ہاتھوں پکڑا ہی نہ جائے۔اور جو پکڑا جائے اس کا منہ کالا کر کے گدھے پر بیٹھا کر پورا علاقہ گھمایا جاتا ہے۔ایسے میں شاکت جرائم کا ہم پیشہ ہوتا ہے تسلی دیتا ہے کہ میں خاندانی چور ہوں۔آباؤ اجداد کا پیشہ بھی یہی تھا ہم نے یزید کے جوتے بھی چرا لیے تھے، بہادر شاہ ظفر کا ایک جوتا آج بھی ہمارے خاندان میں محفوظ ہے۔بلوچستان کے ماحول و منظر کے ساتھ افسانہ نگارت کا قلم تاریخ کے بھولے بسرے واقعات کو بھی یاد کے چوکھٹے میں سجاتا چلا جاتا ہے۔سیاست کے حوالے سے بھی مصنف نے طنزیہ گفتگو کی ہے مثلاً لکھتے ہیں

"گدھے تو سارے اسمبلیوں میں جا بیٹھے بھی توے کی کالک
سے سیاہ کرتے ہیں کوئی ویدر پروف کالا پینٹ تھوڑا ہی ملتے
ہیں ایک ہی وضو میں کالک اتر جائیگی" (۱۱۹)

شوکت چونکہ اس میدان کا پرانا اور پختہ کھلاڑی تھا۔جسے یہ ہنر وراثت میں ملا تھا۔اور پہلے سے اس میدان میں سرگرمِ عمل تھا۔اپنا حریف سمجھ کر چالاکی سے نیکو کو محفل میں سب کے سامنے چور بنا کر پیش کر دیتا ہے۔چونکہ چور پکڑنے کا انعام ۲۰ ہزار روپے تھا اور ساتھ ہی اس فرد کو "مجاہد اعظم" کا خطاب بھی دیا جائے گا۔شوکت نے حاضرین سے خطاب کیا! جب سے یہ مسجد قائم ہوئی ہے۔میں اس کا جاروب کش ہوں۔مجھ میں اتنی روحانیت آ گئی ہے کہ کشف کے ذریعے چور پہچان لیتا ہوں یہ دیکھیے شوکت نے زور سے نیکو کا پائنچہ جھٹکا بوٹوں کا جوڑی زمین پہ آ گری۔مصنف نے اس صورتحال کی منظر کشی بہت عمدہ انداز میں کی ہے۔

''فضا میں ''مجاہد اعظم'' زندہ باد کے نعرے گونجنے لگے نیکو۔۔۔

بوتیاں برسنے لگیں اور شوکت کے سر پر نوٹ نچھاور ہونے لگے

جن پر مجاہد اعظم کی تصویر بنی ہوئی تھی'' (۱۲۰)

آغا گل کا افسانہ ''مجاہد اعظم'' موجودہ دور کی حالت پر طنز ہے جہاں چالاک اور عیار لوگ اپنی عیاریوں کے سبب بڑے بڑے عہدے اور لقب پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

افسانہ ''محلّہ بلیماراں'' بہت ہی دلچسپ افسانہ ہے۔ افسانہ کے عنوان سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ اس محلے کا نام ہے جہاں دلی میں غالب کی رہائش تھی۔ وہ دراصل ''بلی ماراں'' جہاں کشتی رانوں کے بہت سے گھر تھے۔ افسانہ بھرپور تجسس کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ کہ جلال سائنسدان قسم کا آدمی ہوتا ہے۔ اس کے گھر میں ایک جلال، اسکی والدہ، اور ایک بلی جسے وہ ہر وقت ساتھ ساتھ رکھتا ہے۔ یہ بلی مصنف کے نزدیک کسی گھٹیا خاندان کی بلی تھی۔ کبھی اچھل کر اس کے کندھے پر جا چڑھتی ،کبھی محفل کے آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے پھلانگ کر جلال کی گود میں جا بیٹھتی۔ البتہ ماں اس بلی کو کمینی، لالچی اور کم ظرف، بدخصلت اور منحوس سمجھ کر اس کو ایسی جگہ بھجوانے کی سبیلیں کرتی ہے۔ جہاں سے واپس اس کے مکان میں نہ آسکے۔ وہ جلال کے دوست سے التجا کرتی ہے کیا کروں بہت روپیخو چ کیا، مری آباد، کرانی، بلیلی جانے کہاں کہاں پھکوایا۔ ایک بار سریاب میں پھینکا، اس کے پاس نہ جانے کون سا کمپاس ہے کہ لوٹ آتی ہے۔ تم اسے محلّہ بلیماراں میں لے جا کر اس کا کام تمام کر دو۔ چنانچہ دوست پولیس سے چھپ چھپا کر بلی کو بلوچستان گورنر ہاؤس سے پرے ایک جگہ پر چھوڑ آتا ہے۔ اور پھر کبھی واپس نہیں آتی تاہم جو تھوڑی بہت جھڑپ پولیس والوں سے ہوتی ہے جب اسے ڈپٹ کر گورنر ہاؤس پہ روکا گیا۔ کون ہو، کہاں جا رہے ہو، شناختی کارڈ بھی دکھایا، انہوں نے تلاشی کے نام پر ٹٹولا۔ تو انہیں لباس میں حسب معمول کوئی ٹینک، راکٹ، بم طیارہ نہ ملا۔ عالم مایوسی میں سکوٹر کی ڈگی کھولنے کو کہا گیا۔ زبردستی چابی چھین لی ڈگی کھولتے ہی بلی نے زور کی چھلانگ ماری اور انچارج کے سینے پر آ رہی گورنر ہاؤس کے گیٹ کے نیچے جست لگائی اور آناً فاناً گورنر ہاؤس میں غائب ہو گئی۔

راوی بہت متعجب ہوتا ہے کہ بلی گئی اور واپس کیوں نہ آئی کیوں کہ گورنر ہاؤس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ایسے میں راوی حقیقت حال معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔بالآخر میں ایک سیاستدان سے سوال کرتا ہے تو وہ اسے سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ،بقول مصنف:

''یہ معرفت کی باتیں ہیں تمہارے لکھنے پڑھنے کے دن ہیں۔۔۔۔گورنر
ہاؤس ہی دراصل وہ محلّہ بلیماراں ہے جسکی تمہاری بلی کو تلاش تھی اگر محلّہ
بلیماراں بہ چلتنان است ہمیں است وہمیں است۔جب غیر مقامی
بلوچستان سے نہیں نکلتے تو مقامی بلی بھلا کیوں باہر نکل جائے میکدہ ہے
یہاں سکون سے بیٹھ'' (۱۲۱)

افسانہ''محلّہ بلیماراں''ایک ہلکی پھلکی [illegible] کہانی ہے۔اس افسانے کے ذریعے مصنف نے معاشرتی برائیوں پر بھی طنز کے تیر چلائے ہیں۔مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:

'' عورتوں کو تو سبھی مارتے ہیں بلیوں پر تو کوئی ہاتھ نہیں اٹھاتا کاش میں بھی
بلی ہوتی'' (۱۲۲)

کوئٹہ کی سماجی صورتحال،آبادی میں اضافہ کے حوالے سے بھی مصنف افسانے میں اس نوع کی سطور ملتی ہیں:

''کوئٹہ کی آبادی شتر بے مہار کی طرح بڑھ رہی ہے ایسے محلّے ایسی ایسی
آبادیاں پیدا ہو رہی ہیں کہ ہمیں خود ہی پتہ نہیں،حالانکہ عمر گزاری ہے اس
دشت میں [illegible]۔۔۔۔'' (۱۲۳)

کوئٹہ کے سیاسی وسماجی حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو آئے دن فسادات ہوتے ہیں راکٹ گرتے ہیں،بم پھٹتے ہیں،بچپن سے ہی جگہ جگہ روک کر بے عزتی کی جاتی ہے،تلاشی لی جاتی ہے۔جیبیں کھنگالی جاتی ہیں۔لاتیں ماری جاتی ہیں۔اس سلوک کے وہ عادی ہو گئے تھے۔اگر ایسا سلوک نہ کیا جائے تو بقول مصنف:

''بڑی کرخت [illegible] ہوتی ہے دل بجھ سا جاتا ہے'' (۱۲۴)

''فولادی بھگوان'' آغا گل کا ایک افسانہ ہے۔ اس افسانے میں سیاسی نظام کی ناقص کارکردگی پر خوب تنقید کی ہے۔

''فولادی بھگوان'' میں مصنف نے ان بے حس لوگوں پر قلم اٹھایا ہے جو بے تحاشہ قومی سرمایہ اسلحہ بارود پر خرچ کرتے ہیں جبکہ اپنے عوام، قوم کی بنیادی ضروریات پوری کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ ان کو بنیادی حق جو ریاست کے زمہ دار ہوتا ہے۔ اس سے محروم رکھتے ہیں۔ مثلاً اس افسانے میں لوگوں کو دکھانے کیلیے ایک بڑا ٹینک گاؤں میں لایا گیا۔ سکول کے صحن میں شان سے لایا گیا۔ ایسا آہنی ٹینک دشمن کے پاس بھی نہیں۔ بچوں سے تالیاں بجانے کو کہا گیا۔ ٹینک کا خوب اچھی طرح استقبال کیا گیا۔ یہ ٹینک ٹائروں پر نہیں بلکہ چینوں Trac پر لایا گیا۔ لوگوں نے پوچھا اس میں کتنا پانی ہوگا ؟ لیکن ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ درج بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچستان کے دور دراز علاقے جہاں سہولیات برائے نام بھی نہیں ہیں۔ حکومت کی طرف سے وہیں سب سے بڑا مسئلہ پانی کا بھی ہے۔ لوگ ایک ایک بوند پانی کو ترس رہے ہیں۔ اور انہیں جنگی ساز وسامان سے دلاسا دیا جا رہا ہے۔ کھانے کے لالے پڑے ہیں وہاں دشمن سے فتح یابی کے خواب دکھائے جا رہے ہیں۔ آغا گل اس تمام صورتحال کا زمہ دار حکومت کی بدترین کارکردگی کو ٹھہراتے ہیں۔ بلوچستان کو ہمیشہ ہی نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہاں جو قتل وغارت گری، لوٹ مار، دہشت گردی ہو رہی ہے سب حکومت کی غفلت سے ہو رہا ہے۔ افسانہ نگار نے افسانے کے زریعے حکومت اور افسران بالا، قارئین کی توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ بلوچستان کے عوام کو بنیادی ضروریات فراہم کی جائیں۔ مصنف لکھتے ہیں کہ

> '' ٹینک والے نے نفی میں سر ہلایا'' یہ ٹینک انسانوں کو مار سکتا ہے، گاؤں برباد کر سکتا ہے، سکولوں کے پرخچے اڑا سکتا ہے، مگر پانی نہیں نکال سکتا
> ''----- (۱۲۵)

اسی ضمن میں جب ایک ایم بی اے (فنانس) بے روزگار جو ملازمت نہ ملنے کے سبب گاؤں واپس لوٹ جاتا ہے کہ وہاں کچھ کاروبار شروع کرے لیکن گاؤں میں تو پانی پینے کے لیے نہیں وہاں فصلیں کیسے اگائی جائیں لوگ کھائیں گے کیا اور ایسے میں کاروبار کرنے کے خواب سب فضول تھا۔ وہ نوجوان ایک ہندو سے استفسار کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ پانی والے

بھگوان تو چلے گئے تم فولادی بھگوان کے ساتھ رہتے ہو۔فولادی بھگوان کا دل نہیں ہوتا جسے بندوق کی گولی اور چھری کی آنکھ نہیں ہوتی ۔مصنف نے اس افسانے میں اس دوکاندار ہندو کی نفسیاتی صورتحال کو بھی بیان کیا ہے کہ:

''جس کو ہندوستان میں بابری مسجد گرانے کی پاداش میں مسلمان
سوچتا کہ اس کے بیٹے کے قاتل تیل میں تلے جا رہے ہیں بڑے
انہماک سے وہ پکوڑے تلا کرتے'' (۱۳۶)

آغا گل بلوچستان کی تہذیب کے پسِ منظر کے حوالے سے افسانہ ''فولادی بھگوان'' میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔ہزاروں برس پہلے اہل بلوچستان نے کنوئیں کھودے کیا ان
کا نداز نہیں تھا۔۔۔سدیوں پہلے تمہارے بزرگوں نے اتنے کنوئیں۔
۔۔۔۔کہ اس علاقے کا نام ہی چاغی پڑ گیا۔۔۔۔پھر جب پانی کے مینگر
آنے لگے۔تو ہریالی اور شادابی نہ پلٹی مگر زندگی گھسٹنے لگی، گنج دوڑی سے
گزرتی ہوئی خشک سالی سنگر اور سور گز کو لپیٹتی ہوئی پیر لدھا کو مفتوح بنا کر
مستونگ پہ یلغار کرتی۔۔۔'' (۱۲۷)

براہوی ثقافت اور اس کی موسیقی جو کہ جذبات ابھارنے کا دوسرا نام ہے بقول مصنف'

''براہوی کرتو گیتوں میں بھی اعتماد ہے'' (۱۲۸)

آغا گل نے اس افسانے میں براہوی زبان کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں اور ان کے مطالب سے بھی پردہ اٹھایا مثلاً لخپاس (بمعنی درہ)، آماچ (مستونگ کا پہاڑ)، کلی (بخماء، گاؤں)، کوٹیچ (تربوز)، مہارتھی (اکیلا جنگجو جو دس ہزار تیر اندازوں پر بھاری ہو)، ڈاکٹر پادری (مستونگ کا ڈیٹھ کوشکی روڈ جہاں ملتے ہیں وہاں ایک مسیحی مشنری نے انیسویں صدی کے اوائل میں مسافروں کے لیے کنواں کھدوایا تھا جو اسی کے نام سے معنون ہوا)، ٹکری (مکھیا)، چاہ غی (کثرت استعمال سے چاغی کہلاتا ہے بمعنی کنوؤں کا علاقہ)، موب علی (براہوی تلفظ)، مستونگ شہاے دیواناں (مستونگ دیوتا کا

بڑا شہر ہے یادرہے مستونگ میں صدیوں تک شیو دیوتا کا مندر مرجع خلائق رہا)۔افسانے میں کہانی کے ساتھ ساتھ علاقائی زبان کا ناک نقشہ دکھانے میں بھی افسانہ نگار نے کوتاہی نہیں کی۔

آغا گل کا افسانہ ''بوانوٗ'' ڈاکخانے اور اس سے جنم لینے والی کہانی ہے۔''بوانوٗ'' ایک ایسے بچے کی داستان ہے۔جو ڈاکخانے کے بیچ پڑا ہوا ملتا ہے۔ماں باپ لاپتہ ہوتے ہیں۔ڈاکخانے کا ایک ملازم جو اولاد کی نعمت سے محروم ہوتا ہے۔وہ اس بچے جس کا نام ڈاکخانے والے اتفاقِ رائے سے دولت خان رکھتے ہیں۔اس کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے۔وہ بچہ میٹرک کرنے کے بعد ڈاکخانے کے محکمے میں ایک ادنی ملازم سے پوسٹ ماسٹر بن جاتا ہے، وہی سٹاف جو کبھی اسے شودر سمجھتا تھا۔اب دعوتوں پر بلانے لگا اس کا بہت احترام کیا جاتا۔دولت خان چونکہ ایک نااہل افسر ہوتا ہے۔اسی سبب وہ اپنے ماتحتوں پر انحصار کرتا ہوتا تھا۔ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر بے خبر رہا، سٹاف اسے دھڑا دھڑ بلانے لگا۔کسی کے ہاں بچے کی سالگرہ، کسی کے بچے کا عقیقہ تو کسی کی بیٹی کی شادی، ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے وہ ہر تقریب میں شامل ہونے لگا۔کلرکوں، پوسٹ مینوں کی بیویاں بیک وقت اسے پان مٹھائی، چائے کھلانے کی کوشش کرتیں۔پوسٹنگ ٹرانسفر کے فیصلے اسی گھر ہوا کرتے۔جہاں سے وہ پوسٹنگ کے احکامات جاری کیا کرتا۔فلاں کو فلاں جگہ لگا دو۔ان محبتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہ لاکھوں روپے خزانے سے چٹوں پہ نکالے جا رہے تھے۔دیگر ڈاکخانے سب اکاؤنٹ کو کیش نہیں بھجوا رہے تھے۔پی ٹی میں گھپلے ہو رہے تھے۔بیت المال کی رقم خود ہی انگوٹھے لگا لگا کر کھا رہے تھے۔محکمانہ ٹیم کی رپورٹ کے مطابق ممبا (دولت خان) ڈاکخانے کا علی بابا چالیس چور ڈاکخانہ چلا رہا ہے۔اس کے ساتھ ہی ممبا کو فوری طور پر ریٹائرڈ کر دیا گیا۔ایک مدت بعد گزر جانے کے دولت خان کو احساس ہوتا ہے کہ وہ سب سیٹ کے پجاری تھے۔انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی:

''باہر قدموں کی چاپ تھی، جانی پہچانی آوازیں تھیں، سٹاف
کا CLAMOUR تھا، مگر سبھی کسی اور دیس کے باسی تھے،
کسی اور ستارے کی مخلوق جن کا ممبا سے کوئی تعلق نہ تھا نہ
آشنائی تھی۔۔۔۔۔۔چوکیدار نے بھی منہ موڑ کر سگریٹ

سلگالی۔۔۔۔۔عورتیں بھی پاس سے سر جھکا کر گزر گئیں۔

۔۔۔۔کلام تو دور کی بات کسی نے سلام تک نہ کیا" (۱۲۹)

دولت خان لوگوں کے اس رویے کو دیکھ کر بہت مایاس ہو جاتا تھا۔اور پھر وہ نئے نئے آئے پوسٹ ماسٹر کو سمجھانا ضروری سمجھتا ہے کہتا ہے بقول مصنف:

"آپ کو نہیں اس کرسی کو سلام کرنے چلا آیا ہوں دو ٹانگوں والے انسان
سے یہ چار ٹانگوں والی کرسی کسی قدر طاقتور ہے، بیٹھیے اس کوسی سے نہ اٹھا
کریں ورنہ آپ کا بوانٹو گر جائے گا۔۔" (۱۳۰)

آغا گل نے اس افسانے میں براہوی لوک کہانیوں، اساطیری کہانیوں کا ذکر کیا ہے۔لوک کہانیاں سننا اور سنانا اب تک بلوچستان کی ثقافت میں شامل ہے۔مثلاً

بوانٹو: قابوس، براہوی لوک کہانیوں کا غیر مری کردار، اس کی ناک نہیں ہوتی سوئے انسان کی چھاتی پہ بیٹھ کر اسے بے بس کر دیتا ہے۔

کوئٹہ: اصل نام کوٹہ بمعنی قلعہ

گندرخ:: نومولود کو کپڑے میں لپیٹ کر فیتہ باندھنا

اتنھڑ: جنگی مشقوں پہ مبنی مردوں کا جارحانہ رقص

مم: Sphinx مادہ ریچھ جس کا چہرہ عورت جیسا ہوتا ہے۔مردوں کو اٹھا کر کوئٹہ کے مشرقی پہاڑ کوہِ مردار میں لے جاتی ہے۔اور شوہر بنا کر رکھتی ہیں

آغا گل اپنے افسانوں میں علاقائی رسم و رواج، مختلف زبانوں اور بلوچستان کے مختلف مقامات میں بسنے والے انسانوں کی نفسیات کا بخوبی ادراک رکھتے ہیں۔

افسانہ "گوانگو" زیرِ نظر افسانوی مجموعے "گوانگو" کا آخری افسانہ ہے۔اس افسانے میں ماں جو اپنے بیٹے کو مختلف

بھوت پریوں سے ڈرتی رہتی ہے۔اس طرح ماں سے بھوت پریوں کی کہانیاں سن سن کر بچپن سے ڈرا سہا سلیمان جب ڈاکخانے میں افسر بن جاتا ہے تو وہاں بھی اسے یہ عفریت پریشان کرتے رہتے ہیں۔

آغا گل افسانے میں اس کی نفسیاتی صورتحال کی عکاسی بہت عمدہ انداز میں کرتے ہیں کہ جواں ہوکر کفِ افسوس ملا کرتا ،ماں نے ممکنہ جسمانی تشدد سے بچانے کے لیے اس قدر قریب رکھا کہ جیون بھر کا روگ لگ گیا۔ذہن میں پلنے والے دیو مالائی بھوتوں سے کم اذیت ناک ہوتی۔ٹیچر بھی ناقدانہ نظروں سے جانچتے تو وہ سراسیمہ ہوجایا کرتا بھوت اس کے ذہن میں مستقل رہنے لگے تھے۔اسی بچپن کے خوف نے اسے ڈاکخانے کی ملازمت پر مجبور کیا،ڈاکخانے کا گھر،گھر سا ماحول ،ڈاکخانہ اسے اپنا اپنا سا لگتا۔اسے حاکم، ماتحت، پبلک،افسر،ملازمت، ہر شئے اس کو عفریت نظر آتے تھے۔بچپن میں ماں نے اسے اساطیری کہانیاں سنا سنا کر اسے ان دیکھی چیزوں سےخوف میں رکھا۔ایک ملازم جو دفتر میں حاضری لگا کر دن بھر غائب رہتا،آغا گل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''سلیمان کو اکثر چراغ کی ضرورت پڑتی لیکن وہ ہاتھ نہ آتا۔۔۔۔۔
صاف مکر جاتا میں تو یہیں ،وضوخانے میں۔۔۔۔یہ سنتے ہی سلیمان کی
افسری اسرک جاتی۔۔۔اچ نہار یاد آجاتا یوں لگتا جیسے وہ اسے دفتر سے
اچک کر لے چلتا بنے گا۔۔۔۔ادھر سلیمان کو افسر آنکھیں دکھاتے ایک
ہیڈ کلرک تمہارے قابو میں آتا۔۔۔۔وہ بہت خوفزدہ ہوجایا کرتا سلیمان
کو دن میں یک ٹانگی دکھائی دینے لگتا۔۔۔'' (۱۳۱)

مصنف نے افسانے میں جو چراغ کا کردار پیش کیا ہے کہ وہ ڈیوٹی کے وقت دفتر سے غائب رہتا اور بسوں میں منجن بیچتا ہے۔سلیمان کو تجسس ہوتا ہے وہ اسے پکڑنے کے لیے طرح طرح کے حربے اور ہتھکنڈے آزماتا ہے۔''مگر چراغ تلے اندھیرا'' کے مصداق پکڑا نہیں جاتا۔آخرکار ایک مقامی تھانیدار دونوں چراغ کو پکڑ لیتے ہیں مگر چراغ دونوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ:

''اگر آپ سرپرستی کریں تو منجن کا کارخانہ کھول لیں،سریاب کی بسوں تک

محدود رہنے کے بجائے پورے ملک میں مارکیٹنگ کریں ہمارے لوگ
صرف آنکھیں ہی نہیں دانت بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہمارا منجن لکڑ ہضم،
پتھر ہضم کی ضمانت دیتا ہے، گستاخی معاف پہلے تھانوں پر ہن برستا کرتا
تھا اب تو NAB یک ٹنگی کی طرح اچک لیتا ہے تھانوں کر۔۔۔" (۱۳۲)

''گوانگو'' میں جن بھوتوں کا ذکر ہوا ہے۔ وہ نہ صرف بھوت ہیں بلکہ سیاسی وسماجی معنویت بھی رکھتے ہیں۔

''سب سے بڑا گوانگو روپیہ ہے جسے پکارتا ہے وہ گونگا ہو جاتا ہے اسکی زبان
بند ہو جاتی ہے۔'' (۱۳۳)

قانون بنانے والے نہیں چاہتے، انہیں گرفت میں لیا جائے انہیں مرنے
کے بعد بھی توپوں کی سلامی دے کر دفن کیا جاتا ہے'' (۱۳۴)

اس کے علاوہ برصغیر میں مذہب کے نام پر جو سیاسی وسماجی استحصال ہو رہا ہے۔ اس کی طرف افسانہ نگار نے اشارہ کیا ہے۔ سلیمان اپنے ملازم چراغ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ:

''استنجا کر رہا تھا، سلیمان بگڑ گیا، استنجا کر رہے تھے یا گھوڑے دھو
رہے تھے؟ چراغ نے دبی زبان میں کہا آپ میرے عقیدے میں
حائل ہو رہے ہیں۔ اس جرم کی سزا سات برس قید با مشقت تھی'' (۱۳۵)

اس افسانے ''گوانگو'' میں آغا گل نے براہوی لوک کہانیوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ افسانے میں ان کہانیوں کے مفاہیم کی طرف اشارے بھی کیے ہیں۔

گوانگو: رات میں نام لے کر پکارتا ہے کہ فلاں میں تمہارے کے لیے قیمتی تحفہ لایا ہوں۔ جو کوئی جواب دے فوراً زبان بند ہو جاتی ہے۔ گونگا ہو جاتا ہے۔

پیرو: بوڑھے کی شکل میں ملتا ہے۔ مسافروں سے کہتا ہے کہ مجھے اٹھا کر لے چلو ترس کھا کر کوئی اٹھائے تو پیرو کے پیٹ سے تین ٹانگیں نکل آتی ہیں۔ آدمی کو گرفت میں لے لیتی ہیں۔

بلہ: بوڑھیا کی شکل میں مسافر کو پکڑ کر کہتی ہے کہ میری جوئیں نکال انکار کی صورت میں جان سے مار ڈالتی ہے۔

جاتو: عورت کی شکل بنائے لمبے لمبے دانتوں والی، اڑنے والی، کوئی مریض اکیلا ہو تو اس کا کلیجہ چبا جاتی ہے۔

چک: بھیڑیا گدھے کی جسامت کا زرد رنگ کا پرندہ جو انسانوں کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔

داچناں ور: اس بچے کو اٹھا کر لے جاؤ۔

آچ نہار: اونٹ کی صورت میں آدم خور بلا قافلے میں بھٹکنے والے کو پکڑ لیتی ہے۔ قافلے ان سے محتاط رہتے ہیں۔

یک ٹانگی: ایک آنکھ ایک ٹانگ والا دیو

دت: اپنی شکل بدلنے پر قادر ہے۔ جانور، پرندہ، یا کیڑا بن جاتی ہے۔

حوالہ جات:

۱) وقار عظیم، پروفیسر''داستان سے افسانے تک''،۱۹۹۲ء، اردو اکیڈمی، سندھ کراچی، ص۱۷۹

۲) نوازش علی۔ڈاکٹر،''پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال''، ۱۹۹۷ء، ص۲۱۴

۳) سہیل بخاری، ڈاکٹر''اردو داستان، تحقیقی وتنقیدی مطالعہ''، اظہر سنز پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۵۳۰

۴) احتشام حسین، پروفیسر''افسانہ وافسانہ نگار'' اردو اکیڈمی روڈ کراچی، سن ۱۹۸۹ء، ص۱۶۱

۵) معین الرحمٰن سید،''اردو افسانہ وافسانہ نگار'' اردو اکیڈمی روڈ کراچی، سن ۱۹۹۷ء، ص۱۴۱

۶) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر''اردو نثر کا فنی ارتقاء''، ایجوکیشنل بلڈنگ، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص۳۴

۷) محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر''اردو افسانہ ۱۹۴۷ء کے بعد، شعور کراچی، بحوالہ پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال شہزاد منظر پاکستان،'' اسلامی سنٹر جامع کراچی، ۱۹۹۷ء، ص۹۷

۸) آغا گل،''گوریچ''، دی پرائم ٹائمز پریس (پرائیوٹ) لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء، کراچی، ص۱۱

۹) ایضاً، ص۱۱

۱۰) ایضاً، ص۱۵

۱۱) ایضاً، ص۱۷

۱۲) ایضاً، ص۱۴

۱۳) یضاً، ص۱۷

۱۴) ایضاً، ص۱۶

۱۵) ایضاً، ص۲۲

۱۶) ایضاً، ص۲۴

۱۷) ایضاً، ص۲۳

۱۸) ایضاً،ص ۲۴

۱۹) ایضاً،ص۲۲

۲۰) ایضاً،ص۲۷

۲۱) ایضاً ،ص ۲۹

۲۲) ایضاً ،ص ۳۴

۲۳) ایضاً ،ص ۳۶

۲۴) ایضاً ،ص ۳۳

۲۵) ایضاً ،ص ۳۸

۲۶) ایضاً ،ص ۴۰

۲۷) ایضاً ،ص ۳۶

۲۸) ایضاً ،ص ۴۶

۲۹) ایضاً ،ص ۴۱

۳۰) ایضاً ،ص ۴۵

۳۱) ایضاً ،ص ۴۵

۳۲) ایضاً ،ص ۴۶

۳۳) ایضاً ،ص ۴۵

۳۴) ایضاً ،ص ۵۰

۳۵) ایضاً ،ص ۶

۳۶) ایضاً ،ص ۴۷

۳۷) ایضاً، ص ۵۱

۳۸) ایضاً، ص ۵۱

۳۹) ایضاً، ص۵۴

۴۰) ایضاً، ص ۵۴

۴۱) ایضاً، ص،۵۷

۴۲) ایضاً، ص،۵۸

۴۳) ایضاً، ص،۶۶

۴۴) ایضاً، ص،۶۴

۴۵) ایضاً، ص،۶۹

۴۶) ایضاً، ص،۷۰

۴۷) ایضاً، ص،۶۹

۴۸) ایضاً، ص،۷۹

۴۹) ایضاً، ص،۷۳

۵۰) ایضاً، ص،۸۰

۵۱) ایضاً، ص ،۶۷

۵۲) ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، مشمولہ ادبی ورثہ،'' آغا گل کے افسانوں کا امتیاز''

۵۳) راقمہ کا آغا گل سے انٹرویو، جالائی،۱۲ ۲۰۱۲ء

۵۴) آغا گل، ''گورپچ''، دی پرائم ٹائمز پریس (پرائیوٹ) لمیٹڈ،۱۹۹۰ء، کراچی، ص۷۶

۵۵) قرأۃ العین حیدر، ماہنامہ سپرنتک، لاہور، جالائی ۲۰۰۴ء

۵۶) ایضاً ،ص۹۳

۵۷) ایضاً ،ص ۱۰۹

۵۸) ایضاً ،ص ۱۰۳

۵۹) ایضاً ،ص۱۰۶

۶۰) ایضاً ،ص ۱۲۰

۶۱) ایضاً ،ص ۱۲۳

۲۶) ایضاً ،ص ۱۱۳

۶۳) ایضاً ،ص ۱۲۰

۶۴) ایضاً ،ص۱۲۵

۶۵) آغا گل، ''پرتھوی غوری''، مارچ۲۰۱۱ء، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، ص، ۲۵

۶۶) ایضاً ،ص ۲۸

۶۷) ایضاً ،ص ۳۲

۶۸) ایضاً ،ص ۴۳

۶۹) ایضاً ،ص ۵۲

۷۰) ایضاً ،ص ۵۷

۷۱) ایضاً ،ص ۷۲

۷۲) ایضاً ،ص ۶۶

۷۳) ایضاً ،ص ۷۲

۷۴) ایضاً ،ص ۸۲

۷۵) ایضاً ،ص ۸۷

۷۶) ایضاً ،ص ۹۷

۷۷) ایضاً ،ص ۱۰۱

۷۸) ایضاً ،ص ۱۲۱

۷۹) ایضاً ،ص ۱۰۲

۸۰) ایضاً ،ص ۱۱۲

۸۱) ایضاً ،ص ۱۲۴

۸۲) ایضاً ،ص ۱۱۶

۸۳) ایضاً ،ص ۱۲۴

۸۴) ایضاً ،ص ۱۲۴

۸۵) ایضاً ،ص ۱۳۳

۸۶) ایضاً ،ص ۱۲۴

۸۷) ایضاً ،ص ۱۱۹

۸۸) ایضاً ،ص ۱۴۵

۸۹) ایضاً ،ص ۱۲۶

۹۰) آغا گل، ''گوانگو''، ہاشم اینڈ حماد پرنٹر، لاہور، ۲۰۰۵

۹۱) ایضاً ،ص ۲۰

۹۲) ایضاً ،ص ۳۳

۹۳) ایضاً ،ص ۳۷

۹۴) ایضاً ،ص ۳۴

۹۵) ایضاً ،ص ۳۴

۹۶) ایضاً ،ص۳۹

۹۷) ایضاً ،ص ۴۲

۹۸) ایضاً ،ص ۶۳

۹۹) ایضاً ،ص ۶۳

۱۰۰) ایضاً ،ص ۶۵

۱۰۱) ایضاً ،ص ۶۹

۱۰۲) ایضاً ،ص ۷۰

۱۰۳) ایضاً ،ص ۷۱

۱۰۴) ایضاً ،ص ۷۲

۱۰۵) ایضاً ،ص ۸۰

۱۰۶) ایضاً ،ص ۶۸

۱۰۷) ایضاً ،ص ۷۹

۱۰۸) ایضاً ،ص ۷۲

۱۰۹) ایضاً ،ص ۷۹

۱۱۰) ایضاً ،ص ۹۶

۱۱۱) ایضاً ،ص ۹۴

۱۱۲) ایضاً ،ص ۹۲

۱۱۳) ایضاً ،ص ۹۷

۱۱۴) ایضاً ،ص ۹۹

باب چہارم:

مجموعی جائزہ

ب مجموعی جائزہ:

افسانہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو زندگی کا نہایت قریب سے مطالعہ اور مشاہدہ کرتی ہے۔افسانہ نگار کا تعلق انسانی معاشرے اور تغیر پذیر زندگی کے ساتھ ہوتا ہے۔وہ مختلف کیفیات، حالات، اور واقعات سے گزرتا ہے۔اور تخیل کی بلندی سے اپنے فن پارے کو الفاظ کے زریعے یا وسیلے سے قاری تک پہنچاتا ہے۔فنکار کا ذاتی تجربہ ہوتا ہت جس کا تعلق براہ راست انسان اور اسکی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے۔فنکار نہ صرف اپنے فن کے زریعے زنگی کے مخفی گوشوں سے پردہ اٹھاتا ہے، بلکہ تاریخی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور نفسیاتی شعور کو اجاگر کرتا ہے۔

آغا گل کا شمار دورِ جدید کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے وہ اپنے عہد کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے تیئں مقامی رنگ کو اپنے تخلیقی وجود کا حصہ بنا کر اس جانب، دیگر لکھنے والوں کو متوجہ کیا ہے۔یہ پہلے تخلیق کار ہیں جنھوں نے ریجنل ازم کو اپنایا ہے، بلکہ یہاں یہ کہنا مقصود ہے جو آغا گل نے کیا وہ ان کی علیحدہ پہچان بن گیا، اور نے والوں کے لیے یقیناً مثال بھی، حمید شاہد آغا گل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> ''آغا گل بلوچستان پر لکھنے والے افسانہ نگاروں میں سے ایک اچھے
> افسانہ نگار ہیں گو کہ افسانہ اب بہت بدل گیا ہے مگر ان کا کام اپنی
> پہچان آپ ہے'' (۱)

ان کے افسانوں میں بلوچستان کے ریگزاروں، دریاؤں اور دل کش مقامات کا ذکر بہت عمدگی سے کیا ہے۔ان کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ بلوچستان کے ذکر کرنے کے لیے کسی تمہید سے بات شروع کریں ۔بلکہ روانی میں بات کرتے چلے جاتے ہیں۔وہ انتہائی دردمندی کے ساتھ بلوچستان کے بنیادی مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں۔ایک خاص خطہ اور سرزمین کا ذکر ایسی فضا قائم کر دیتا ہے کہ قاری کے لیے افسانہ قابلِ تجسس ہوتا چلا جاتا ہے۔
آغا گل کے ہاں جو سیاسی شعور ملتا ہے وہ بہت واضح اور تلخ ہے، وہ سیاست اور سیاستدانوں پر چوٹ کرتے معلوم ہوتے ہیں۔

بلوچستان میں مرکزی مضبوط حکومت کے بجائے قبائلی Confederacy رہی۔البتہ اٹھارویں صدی میں

بھی یہاں فیوڈل ازم پھیل گیا۔اور انفرادیت معدوم ہوگئی۔آغا گل نے بلوچستان میں رائج سیاست کی اصلیت (اچھائی برائی) خوب وناخوب کو بڑی عمدگی، دردمندی اور مہارت سے ہمارے سامنے پیش کردیا ہے۔ان کا اسلوب بیان بلوچستان کی تہذیب وثقافت کے پسِ منظر میں ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔

''سیاست چند خاندانوں کے درمیان اقتدار کے الٹ پھیر کا نام ہے'' (۲)

آغا گل نے بلوچستان کے سیاسی حالات کی خرابی اور سیاستدانوں کی نااہلی اور قبائلی نظام پر اپنے افسانوں اور ناولوں میں جابجا طنز کیا۔مثلاً افسانہ ''گنوگ'' میں ایک جگہ لکھا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں ہمارے سردار اور پیر ہیں، ورنہ تو سردار ہمیں دیمک کی طرح کھا رہے جوؤں اور پسوؤں کی طرح ہمارے خون پر پل رہے ہیں۔طنز کے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں'' کاری گر، فقیر، افسر حتیٰ کی گورنر بھی خام مال کی طرح ناگزیر طور پر باہر سے منگوائے جاتے ہیں، جیسے منرل واٹر پہاڑوں آتا ہے''

جہاں جہاں آغا گل سے ممکن ہوا انہوں نے تاریخی حوالے بڑے اہتمام سے پیش کیے ہیں۔اوران تاریخی حوالوں کی وضاحت میں چلے جاتے ہیں۔افسانوں میں زیادہ تر بلوچستان کی تاریخ کا ذکر ہے اور یہاں تمام اہم تاریخی واقعات کو بیان کیا ہے۔اس تاریخ کی وجہ سے قاری کو تاریخی حوالے ڈھیروں کتب کی ورق گردانی کے برعکس بڑے آرام سے میسر آجاتے ہیں۔مگر افسانے کی فضاء خاص طور پر متاثر ہوتی ہے۔آغا گل کا تاریخ شعور دراصل ان کے مطالعے کا بین ثبوت ہے۔مگر ان کی وضاحت اور تشریح افسانے کو متاثر کرتی ہے۔

آغا گل بلوچستان کے ان تاریخی واقعات ہی کو پیش نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی تحریروں میں بلوچستان میں نو آبادیاتی تمدن کے اثرات کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔یہاں انگریز کی آمد اور آمد کے مقاصد (یعنی روس کا مقابلہ کرنا اور گرم پانیوں تک پہنچنے سے روکنا)، اس کے اثرات بلوچستان کی تمدنی زندگی پر، نئے روزگار کے مواقعے کی دستیابی اور بیرون بلوچستان سے مختلف ہنر وفن جاننے والے اہل حرفہ کی آمد کا احوال بھی ان کے فکشن میں جابجا نظر آتا ہے۔

بلوچستان میں اقتدار اور روایات کو بہت ترجیح دی جاتی ہے۔ چاہے کتنے ہی سنگین حالات کیوں نہ ہوں۔ اس کے باوجود رشتوں کا احترام ہر حال میں لازم وملزم سمجھا جاتا ہے۔ رشتوں کا تقدس پامال نہیں کیا جاتا ہے۔ چاہے جان سے ہاتھ کیوں نہ دھونا پڑیں۔ وہ لوگ اپنی روایات میں جینا پسند کرتے ہیں۔ ان کے ہاں علاقائی بودوباش کا ذکر آتا ہے تو ساتھ ہی دورِ جدید کی ستم ظریفی بھی کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ روایت سے کٹنا نہیں چاہتے تو دوسری طرف جو رسم ورواج ان کو پسند نہیں۔ ان کی بھی خوب خبر لیتے ہیں۔ اس کے لیے اپنے بے باکانہ خیالات کا بے دریغ اظہار کرتے ہیں۔ اس میں سود وزیاں کا خیال نہیں رکھتے۔ مثلاً

''روایت ایک پکے ہوئے پھل کی مانند ہے، اسے نہ توڑو تو
خود ہی پک کر گر جایا کرتی ہے'' (۳)

مگر جہاں روایت پسندی کی بات آتی ہے تو

''براہوی کلچر کتنا پاکیزہ۔۔۔ تھا اب ہم غلیظ شہروں میں آبسے ہیں
ہماری مجبوری بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی ہے'' (۴)

ان کے ایک افسانے ''ھلی'' میں کردار نبو جو انگریزوں کے سخت مخالف ہوتا ہے۔ لیکن جب ایک انگریز بھڑیئے کا شکار بننے والا ہوتا ہے۔ نبو مخالفت زدہ کی مدد کرنا اس کلچر کا جزو لاینفک ہے۔ سبی کا میلہ پاکستان بھر میں مشہور ہے۔ یہی شہر بلوچستان کی تاریخ میں سنہری لفظوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ یہ میلہ بلوچستان کی ثقافت کا ایک زندہ جاوید مظہر ہے جو کہ ہر سال منعقد ہوتا ہے۔ بلوچستان کے علاوہ ملک بھر سے لوگ اس میں شامل ہونے اور اس کی رونقیں دیکھنے آتے ہیں۔ یہاں عجیب الخلقت جانوروں کی نمائش اور خرید وفروخت ہوتی ہے۔ جسے عالمی شہرت حاصل ہے۔

یہ میلہ بلوچستان کی ثقافتی وسماجی زندگی کی علامت ہے۔ یہاں ایسے کھیل تماشے منعقد ہوتے ہیں جو کہ بلوچستان کا خاصہ ہیں۔ پھر بلوچستانی دستکاری کے شہکار بھی یہاں بیچے اور خریدے جاتے ہیں۔ اسی طرح کے دیگر اسٹال بھی لگتے ہیں جہاں صرف ایسی چیزیں فروخت ہوتی ہیں جو کہ بلوچستان کے محنت کار سارا سال اپنی محنت سے گھروں میں تیار کرتے ہیں۔ جو یہاں کی گھریلو ثقافتی زندگی کے اہم عناصر ہیں۔ مثلاً مخصوص قسم کے برتن کپڑے، آرائش وزیبائش کا سارا سامان، کشید

کاریوں کے اعلیٰ نمونہ جات وغیرہ وغیرہ، اس لیے آغا گل کے افسانوں میں سبی میلے کا ذکر آتا ہے۔

آغا گل نہ صرف قاری کو بلوچستان کے موسموں، آب وہوا، جغرافیائی خدوخال، مقامی فصلیں، دیہات اور قصبوں میں رونما ہونے والے روزمرہ سماجی حالات وواقعات بھی ان کی تحریروں میں بخوبی اجاگر ہوتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک ہی نہیں آغا گل نے اپنے افسانوں کی قبائلی زندگی اور اس کی سادگی و پرکاری، قبائلی جھگڑے، لڑائیاں اور تصفیے ہونے کی صورتحال کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ان جھگڑوں کی وجوہات بھی یہاں بیان کی ہیں۔ اور اجتماعی ثقافتی وتہذیبی زندگی کے ساتھ ساتھ انفرادی سطح پر بھی قبائلی افراد کی زندگیوں کا احوال بھی قلم بند کیا ہے۔ مرد عورت کے جذباتی، نفسیاتی واحساساتی مسائل کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ عورت جو لور کے بدلے میں بیچی جاتی ہے یا جسے مال مویشی کی طرح قصاص اور دیت میں دیا جاتا ہے۔ یا اس کی حیثیت ایک خادم ایک نوکرانی یا اولاد پیدا کرنے کی ہوتی ہے، اور اس کی شخصی، ذاتی، سماجی زندگی بطور انسان مفقود ہو کر رہ گئی ہے۔ آغا گل کے افسانوں میں خصوص جگہ پائی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بلوچستان کی ثقافت اور وہاں کے معاشرے سے قارئین کو روشناس کرایا۔ بلوچ ثقافت میں پڑوسی کے حقوق کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح پناہ گزین جو دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے آئے ہوں۔ انہیں باہوٹ (زیر پناہ) کہا جاتا ہے۔

بلوچستان میں اگر کوئی ذاتی دشمنی یا قبائلی جنگ وغیرہ میں جان کا خطرہ ہو تو دوسرے قبیلے کے باہوٹ بن جاتے ہیں۔ اور دوسرے قبیلے کے افراد اپنے باہوٹ کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح بلوچ ثقافت کے افتخار کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو براہوی معاشرے کو برتری حاصل ہے۔ کہ محض ایک رسم ''ہڈ پیر غنگ'' ادا کر کے کوئی بھی شخص براہوی اقوام میں ضم ہو سکتا ہے۔ وہیں آغا گل ان روایات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جو وہاں قانون کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً علاقے کے قانون کے مطابق سیاہ کاری کا کیس یعنی ناجائز تعلقات رکھنے والے جوڑے کو قتل کر دینا عورت کے ورثاء کا قانونی حق ہے ایسے تعلقات کے باعث قتل کو سیاہکاری کا جرم سمجھا جاتا ہے۔ لہذا قبائلی، معاشرے میں ایسے قتل قابل تعزیر نہیں ہیں۔

آغا گل بلوچستان میں موجود مختلف نسلوں، براہوی، بلوچ، پشتون وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ان کے عادات وخصائل ،رسم ورواج، پسند ناپسند کے احوال کے ساتھ ان کے لسانی مزاج کی بھی جھلک دکھائی ہے۔مختلف علاقائی زبانوں کے الفاظ اوران کے اردو میں معنی بھی درج کیے گئے ہیں۔یہ چیز ان کو معاصر افسانہ نگاروں سے مختلف بناتی ہے۔اور معتبر بھی ،مثلاً براہوایک وسیع زبان ہے۔مشک اور مشکیزہ کے لیے اس میں بے شمار لفظ ہیں۔جن کا مترادف دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتا۔اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دس ہزار سے براہوی خودکفیل رہے۔ضروریات کی تمام اشیاء خام مال سے ہی خود بنا لیا کرتے خودداری اور خود کفالت لازم وملزم ہے۔ایزک (دہی لسی کا مشک)،زک (گھی کا مشک)،دبہ (تیل کا مشک)، ،امیان (آٹے کا بڑا مشک)،گونچان ا(آٹے کا سفری مشک)،اسی طرح انہوں نے اپنے افسانوں میں جو بلوچی الفاظ استعمال کیےان کے مطلب بھی بتائے جیسے گوریچ (یخ بستہ ہوائیں)،تربور

(کزن)،پوغث (مینڈک)،گنوگ،(دیوانہ)انہوں نے اپنے افسانے گوریچ میں جن ہواؤں کا ذکر کیا جیسے سرگوات،نسیاری،ناشی،ایرت گوات،لوڑ،گوش ان ناموں کے ساتھ ساتھ معنی ومفہوم کی بھی وضاحت سے بیان کیے ہیں۔کئی مقامات پر بلوچی کہاوتیں،موقع محل کی مناسبت سے استعمال کرتے ہیں مثلاً ایک بلوچی کہاوتیں جو وہاں بہت مشہور ہے''کہ داتک آستیں شہ مرید گوہراں متیں'' شہ مرید جو ایک معروف بلوچی لوک داستان کا مشہور ہیرو ہے۔اس کا بلوچی لوک ادب شاعری میں وہی مقام ہے جو پنجابی میں ہیر وارث میں رانجھا کا ہے۔

ان کے افسانوں کے نام کے ساتھ ساتھ بلوچی زبان میں ان کے کرداروں کے نام بھی بلوچستان میں رکھے جانے والے ناموں میں سے ہیں۔یہ نام ایسے ہیں جو صرف وہیں رکھے جاتے ہیں اور پاکستان کے دیگر علاقوں میں سننے میں نہیں آتے،مثلاً نبو جان،نکری،وغیرہ۔

آغا گل اپنی تحریروں میں دوسرے مذاہب کا ذکر بھی مختلف حوالوں سے لاتے ہیں۔انہوں نے مسحیت کا ذکر احترام سے کیا ہے۔مسیحی ومسلم کمیونٹی کے مابین پل کا کام کیا۔دونوں کو ذیل طور پر قریب لایا۔''آکاش ساگر'' ایسا افسانہ ہے جس کا آغاز ہی''توریت'' کی پہلی کتاب پیدائش سے کیا ہے۔افسانہ''ٹرن ٹیبل'' بھی مسیحی کردار آرتھر کے گرد

آغا گل بلوچستان میں موجود مختلف نسلوں، براہوی، بلوچ، پشتون وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ان کے عادات وخصائل ،رسم ورواج، پسند ناپسند کے احوال کے ساتھ ان کے لسانی مزاج کی بھی جھلک دکھائی ہے۔مختلف علاقائی زبانوں کے الفاظ اوران کے اردو میں معنی بھی درج کیے گئے ہیں۔یہ چیز ان کو معاصر افسانہ نگاروں سے مختلف بناتی ہے۔اور معتبر بھی ،مثلاً براہوا ایک وسیع زبان ہے۔مشک اور مشکیزہ کے لیے اس میں بے شمار لفظ ہیں۔جن کا مترادف دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتا۔اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دس ہزار سے براہوی خود کفیل رہے۔ضروریات کی تمام اشیاء خام مال سے ہی خود بنا لیا کرتے خوداری اور خود کفالت لازم وملزم ہے۔ایزک (دہی لسی کا مشک)،زک (گھی کا مشک)،دبہ (تیل کا مشک)، ،امیان (آٹے کا بڑا مشک)،گونچان ا(آٹے کا سفری مشک)،اسی طرح انہوں نے اپنے افسانوں میں جو بلوچی الفاظ استعمال کیے ان کے مطلب بھی بتائے جیسے گوریچ (یخ بستہ ہوائیں)،تربور

(کزن)،پوغٹ (مینڈک)،گنوگ،(دیوانہ) انہوں نے اپنے افسانے گوریچ میں جن ہواؤں کا ذکر کیا جیسے سرگوات،خسیاری،ناشی،ایرت گوات،لوڑ،گوش ان ناموں کے ساتھ ساتھ معنی ومفہوم کی بھی وضاحت سے بیان کیے ہیں۔کئی مقامات پر بلوچی کہاوتیں،موقع محل کی مناسبت سے استعمال کرتے ہیں مثلاً ایک بلوچی کہاوتیں جو وہاں بہت مشہور ہے''کہ داتک آستیں شہ مرید گوہراں متیں''شہ مرید جو ایک معروف بلوچی لوک داستان کا مشہور ہیرو ہے۔اس کا بلوچی لوک ادب شاعری میں وہی مقام ہے جو پنجابی میں ہیر وارث میں رانجھا کا ہے۔

ان کے افسانوں کے نام کے ساتھ ساتھ بلوچی زبان میں ان کے کرداروں کے نام بھی بلوچستان میں رکھے جانے والے ناموں میں سے ہیں۔یہ نام ایسے ہیں جو صرف وہیں رکھے جاتے ہیں اور پاکستان کے دیگر علاقوں میں سننے میں نہیں آتے ،مثلاً نبوجان،بکری،وغیرہ۔

آغا گل اپنی تحریروں میں دوسرے مذاہب کا ذکر بھی مختلف حوالوں سے لاتے ہیں۔انہوں نے مسیحت کا ذکر احترام سے کیا ہے۔مسیحی ومسلم کمیونٹی کے مابین پل کا کام کیا۔دونوں کو ذیل طور پر قریب لایا۔''آکاش ساگر''ایسا افسانہ ہے جس کا آغاز ہی''توریت'' کی پہلی کتاب پیدائش سے کیا ہے۔افسانہ''ٹرن ٹیبل'' بھی مسیحی کردار آرتھر کے گرد

گھومتا دکھائی دیتا ہے۔اپنی بیشتر تحریروں میں جس طرح بائبل مقدس کے حوالہ جات دیئے ہیں۔باقاعدہ آیات کوٹ کی ہیں۔جو پڑھنے والوں کو دریائے حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ان کے افسانوں کے علاوہ ہابیل وقابیل ، پروانہ، ہمت، قبرستان کی موت وغیرہ، مسیحیت کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔انہوں نے مسیحیت اور ہنوؤں کے بارے میں جو لکھا وہ ذاتی تعلقات اور تجربات کی بنیاد پر لکھا۔ہندؤں کے مذہب اس کی تعلیمات سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ہندو ذہن اور ذہنیت پر ان کا افسانہ ''دوسری بابری مسجد'' ہے۔

آغا گل کی ناول نگاری بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔انہوں نے ناول اگرچہ بہت طویل نہیں لکھے ان کی ضخامت صرف سوا سو کے قریب صفحات پر مشتمل ہے۔تاہم ان کے پلاٹ مضبوط، کردار بلوچستان کی معاشرتی زندگی سے تعلق رکھنے والے مکالمہ، جاندار اور منظر کشی بھی کی گئی نظر آتی ہے۔''دشتِ وفا'' آغا گل کا ایک اہم ناول ہے۔یہ ناول بلوچستان کی حالیہ دہشت گردی اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کی عکاسی کی گئی ہے۔یہ ناول مزاحمتی ناول کے زمرے میں آتا ہے۔ناول میں منظر کشی بھی جاذب توجہ ہے۔راجار سالوا اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''ناول نگار سخت اور گھردرے پہاڑوں کے پتھروں میں خوبصورت کہانیاں تراشتا ہے۔گل جی پہلے زمانوں میں ہوتا تو ان پہاڑوں میں مہاتما بدھ کے مجسمے تراشتا یا شاید ہو سکتا تھا ''عالیہ کے مجسمے'' یہ نام بار باران کی تحریروں میں ایک خاص معنویت کے ساتھ آتا ہے''

آغا گل نے اپنے ناول میں بلوچستانی عورت کو بہت باپردہ پیش کیا ہے جب کہ ''دشتِ وفا'' کی ہیروئن رخسانہ کو بہت بے باکی پیش کیا ہے۔اس کا تعلق پشاور سے ہے اور ہندکو بولتی ہے۔اسی ایک ناول میں ہی نہیں بلکہ تینوں ناولوں کی ہیروئینوں کا تعلق بلوچستان کی سرزمین سے نہیں ہے۔اس حوالے سے مصنف کے تعصبات اور پسند ناپسند کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ناول ''بیلہ، بابو'' دونوں پر مقامی انداز چھایا ہوا ہے۔ان کا مخصوص ادبی سٹائل بابو اور خاص طور پر بیلہ میں Dominant ہے۔وہ معاشرے کے جیتے جاگتے کرداروں کو اپنے منفرد اسلوب کے زریعے ادبی جامعہ پہنا دیتے ہیں۔اردو ادب کے بیشتر قارئین کے لیے یہ انداز نیا ہو سکتا ہے۔ناول ''بیلہ'' موضوع کے اعتبار سے ایک عام کہانی یعنی عشق و محبت کی حکایت ہے اور مصنف نے اس ناولٹ میں بلوچستان کے لوگوں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔اس

ناول میں منعکس کیا ہوا عشق بلوچستان کی اولین سماجی بغاوت ہے، کہانی عام کہانیوں جیسی ہے۔ کچھ نیا پن نہیں ہے۔ جسے کرداروں کے ذہنی، روحانی، سماجی، نفسیاتی مسائل کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول طویل نہیں ہیں۔ اسے اگر Pocket drama کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کردار رحمان بلوچ معاشرے سے لیا گیا ہے۔ اس کردار کے ذریعے بلوچستانی نفسیات اور پہاڑی علاقوں میں قبائلی لڑائی والے حالات کے اثرات کو کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے ماحول کی عکاسی اس انداز سے کی ہے کہ کوئی انجانا انسان یا غیر ملکی بھی بلوچستان کے قبائلی نظام، رسم وروایات، معاشی و معاشرتی زندگی اور خاصطور پر کوئٹہ سے کراچی تک کے تمام علاقوں کی منظر کشی کا باریک بینی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ناول ''بابو'' میں بلوچستان چلتا پھرتا بولتا محسوس ہوتا ہے۔ آغا گل دریاؤں، پہاڑوں، تفریحی مقامات، ہوٹلوں کا ذکر بڑی عمدگی سے کرتے ہیں۔ ''بابو'' بلوچستان کی تہذیب وثقافت کے پسِ منظر میں ہے۔ خاص طور پر راجستھانی لوگوں اور رہن سہن، رسم ورواج، عادات (معاشرے کی برائیوں اور تہذیب وثقافت) وغیرہ پر مشتمل ہے مثلاً

''بابو نے اچھی خاصی چڑھائی ہوئی تھی۔۔۔ والدین سے فوراً کہا
نسیم کا رشتہ مانگیں اس کی والدہ کئی برس کوئٹہ رہنے کے باوجود سخت
راجستھانی تھی، اس کے خون میں بلوچستان سے عداوت بھری ہوئی
تھی۔۔۔'' (۲)

آغا گل کے تینوں ناول پڑھتے ہوئے ''دشتِ وفا''، بابو، بیلہ'' یوں گمان ہوتا ہے جیسے آدمی کوئٹہ کے بازاروں گلیوں میں چل پھر رہا ہو۔ وہاں کے ہوٹلوں یعنی (ریستورانٹ) پر بیٹھا چائے پی رہا ہو۔ دوستوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنا کوئٹہ بلکہ بلوچستان کی ثقافتی زندگی کا ایک لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ ان ناولوں اور افسانوں میں ایسے مناظر متعدد بار ملتے ہیں۔ اور کوئٹہ کی ثقافتی زندگی کے اس رخ کی تصویر کھینچتے ہیں مثلاً ناول ''بابو'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اگر بلدیہ ہوٹل چلیں تو سبھی کو چائے پلوائے، سموسے بھی کھلوائے گا،
بلدیہ ہوٹل کے سموسوں کے نام سن کر سبھی کے منہ میں پانی بھر آیا، ترنت
جھگڑا چھوڑ کر دوست بن گئے۔۔۔'' (۷)

بلوچستان میں خاص طور پر ہوٹلوں اور ہوٹلوں اور کوچوں میں گانے بہت شوق سے سنے جاتے ہیں۔ براہوی گیتوں اور انڈین اداکاروں کا ذکر بھی بلوچستان کے طبقا میں دکھائی دیتا ہے۔

''بیلہ'' میں مقامی زبان کے الفاظ یا بلوچی زبان کا عنصر ''بابو'' اور ''دشت وفا'' ناولوں کی نسبت کم دکھائی دیتا ہے۔ آغا گل کا بیانیہ انداز اسلوب ہے۔ ان کے اسلوب میں لطافت پائی جاتی ہے۔ جس سے قاری میں تاثیر کا عنصر پیدا ہوتا ہے۔ قاری ناول یا افسانہ پڑھتے ہوئے بوریت یا اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ امر زیادہ نمایاں نہیں۔ یہ خاص اسلوب اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ بلوچستان کے کلچر اور تحریکوں کا چلنا اور تاریخی واقعات کا ذکر اپنے ناولوں میں عمدگی سے کرنے کا ہنر اس لیے رکھتے ہیں کہ بلوچستان کا معاشرہ ان کے ناولوں کو پڑھ کے نصیحت حاصل کر سکے۔ تاکہ معاشرے کی اصلاح بہتر انداز میں ہو سکے۔

آغا گل کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی سخت سے سخت صورت کو ہی نہیں دیکھتے بلکہ زندگی کے پورے ''کل'' پر نظر دوڑانے اور اس کے پورے گرد و پیش کو منور کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ توضیح اس کی یہ ہے کہ وہ افسانے کے ساتھ زندگی کا پورا مد و جزر ناول میں پیش کرنے اور کسی سماجی و تہذیبی اور سیاسی مسئلے پر لمبے عرصے تک سوچنے والے فنکار بھی ہیں۔

آغا گل کوئٹہ کے گورکی ہیں۔ گورکی جن دنوں اٹلی میں تھے۔ تو انہوں نے ''اٹلی کہانیاں'' کے عنوان سے ایک افسانوی مجموعہ لکھا۔ جسمیں اس شہر کو اس خوبصورت طریقے سے انہوں نے متعارف کروایا تھا۔ کہ وہاں کا ایک ایک کوچہ ہمارا دیکھا بھالا ہے۔ جبکہ آغا گل بھی جب اپنی کہانیوں میں اپنے آبائی شہر کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ بھی شہر مستانہ کی جب یہ ایک ننھا سا پر سکون شہر ہوا کرتا اور یہاں ایک جم عفیر اور اس کا شور نہ ہوتا تو ٹھیک ٹھاک آدمی نستالجیا کا شکار ہو کر پرانے شال کوٹ (کوئٹہ) کو یاد کرنے لگتا ہے۔

اگر چہ افسانہ وناول نگاری ایک مشکل فن ہے مگر آغا گل کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک جدت پسند، روحانیت پسند، انسانیت پسند، جذباتیت پسند اور فطرت پسند ادیب ہیں۔ جو زندگی کو مذہب، دنیا، معاشرے کے ہر لحاظ سے دیکھتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں نکھار آتا جا رہا ہے۔ وہ ترقی کے سفر پر گامزن ہیں امید ہے کہ ان کا فن آنے والوں کے لیے نہ صرف مستقل راہ ثابت ہوگا بلکہ اردو ادبی روایت میں ان کا منفرد مقام متعین کرے گا۔ گزشتہ صفحات میں حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ آغا گل کی تحریروں میں بلوچستان کی تہذیب وثقافت کی جس انداز میں بھرپور عکاسی کی گئی ہے اس کی نشاندہی کی جائے اور اس بات کا بھی جائزہ لیا جائے کہ موصوف نے اپنے خوب صورت لطیف انداز میں کسی طرح اس ماحول ومنظر کی عکاسی کی ہے اس کا احاطہ کیا جائے۔ میرے خیال میں اردو فکشن نگاروں میں آغا گل پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں پاکستان کے ایک اہم خوبصورت صوبے کی مشکلات ، مسائل اس کے بسنے والے لوگوں کی عادات کو اس پس منظر میں بھرپور فنی ادراک کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ آغا گل کی تحریروں کو بلوچستان کی تہذیب وثقافت کے آئینے میں دیکھایا جائے۔ پیشِ نظر تحقیق وتنقید میں کچھ کمی، کوتاہی ہوسکتی ہے۔ جو طالب علمانہ تحریر میں ہوتی ہے، لہذا میری اس اولین کوشش کو اس نظر سے دیکھا جائے۔

مجموعی جائزہ

حوالہ جات:

۱) حمید شاہد، ''ماہنامہ روشناس''، آغا گل نمبر، جلد نمبر۱۴، شمارہ نمبر۲، نومبر ۲۰۱۱ء، ص ۲۲

۲) آغا گل، ''گورپچ''، پرائم ٹائمز پریس (پرائیوٹ)، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۱

۳) ایضاً، ص ۵۹

۴) ایضاً، ص ۱۲۰

۵) ایضاً، ص ۷۸

۶) آغا گل، ''بابو'' رنگِ ادب پبلشر، کراچی، جنوری، ۲۰۱۱ء، ص ۲۶

۷) ایضاً، ص ۱۱

کتابیات

کتابیات

بنیادی ماخذات

افسانہ:

۱) آغا گل، ''گورپچ'' کراچی، دی پرائم ٹائمز پریس (پرائیوٹ) لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء

۲) آغا گل، ''گوانگو''، لاہور، ہاشم اینڈ حماد پرنٹرز، ۲۰۰۵ء

۳) آغا گل، ''پرتھوی غوری''، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، مارچ، ۲۰۱۱ء

ناول:

۱) آغا گل، ''دشتِ وفا''، لاہور، کلاسیک چوک ریگل مال، ۱۹۸۲ء

۲) آغا گل، ''بیلہ''، ادارہ الحمراء، لاہور، ۲۰۰۶ء

۳) آغا گل، ''بابو''، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

ثانوی ماخذات:

۱) آزاد کوثری، ''نئے افسانے کی سماجی بنیادیں''، لاہور، رہتاس بکس، ۱۹۹۱ء

۲) اختر سلیم، ڈاکٹر، ''افسانہ حقیقت اور افسانہ نگار''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۳) اختر سلیم، ڈاکٹر، ''افسانہ حقیقت سے علامت''، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۲ء

۴) انوار احمد، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ تحقیق وتنقید''، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۸۸ء

۵) انوار احمد، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ''، فیصل آباد، مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء

۶) اے بی اشرف، ڈاکٹر، ''کچھ نئے پرانے افسانہ نگار''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء

۷) اشعر مسعود، ''سارے افسانے''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

۸) اظہرہ پروین، ڈاکٹر، ''اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید''، علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۰ء

۹) انجم شفیق، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں)، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء

۱۰) احتشام حسین، پروفیسر ''افسانہ اور افسانہ نگار'' کراچی، اردو اکیڈمی، ۱۹۸۹ء

۱۱) افروز اسماعیل، ''ترقی پسند افسانہ نگاری میں رومانوی عناصر''، مقالہ تحقیق برائے (ایم۔اے)، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۳ء

۱۲) بریلوی عبادت، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ کی تنقید''، لاہور، ادارہ ادب وتنقید''، ۱۹۸۲ء

۱۳) بیگ حامد مرزا، ڈاکٹر ''اردو افسانے کی روایت''، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۱۹۹۱ء

۱۴) بیگ حامد مرزا، ڈاکٹر ''افسانے کا منظرنامہ''، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۲ء

۱۵) بیگ حامد مرزا، ڈاکٹر ''تیسری دنیا کا افسانہ''، لاہور، خالدین، ۱۹۸۲ء

۱۶) بیگ حامد مرزا، ڈاکٹر، گناہ کی مزدوری''، اسلام آباد، سفینہ ابلاغ، ۱۹۹۱ء

۱۷) حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر ''مشمولہ ادبی ورثہ، آغا گل کے افسانوں کا نشان امتیاز''، سن ندارد

۱۸) خاکی، مسعود رضا، ڈاکٹر ''اردو افسانے کا ارتقاء، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۷ء

۱۹) خان، اسد محمد، ''تیسرے پہر کی کہانیاں''، کراچی، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۶ء

۲۰) سجاد انور، آج (افسانے)، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۲ء

۲۱) سدید انور، ڈاکٹر ''اردو افسانہ عہد بہ عہد''، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء

۲۲) سدید انور، ڈاکٹر ''اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش''، الٰہ آباد، اردو رائٹر گلڈ، سن ندارد

۲۳) ممتاز شیریں، ''اردو افسانے پر مغربی افسانے کا اثر''، علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۲ء

۲۴) وقار عظیم، سید، ''داستان سے افسانے تک''، کراچی، اردو اکیڈمی، ۱۹۶۰ء

۲۵) وقار عظیم، سید، ''فن افسانہ نگاری''، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء

۲۶) وقار عظیم، سید، ''ہمارے افسانے''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۵۰ء

۲۶) عشرت رحمانی، ''چند ہم عصر افسانہ نگار''، سن ندارد

۲۷) فوزیہ اسلم، ڈاکٹر ''اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات''، اسلام آباد، پورب اکادمی، سن ندارد

۲۸) فردوس انور قاضی، ڈاکٹر ''اردو افسانہ نگاری کے رجحانات''، ایف ڈی پرنٹرز، ۱۹۹۰ء

۲۹) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ''اردو نثر کا فنی ارتقاء''، لاہور، ایجوکیشنل بلڈنگ، ۱۹۹۴ء

۳۰) فرمان فتح پوری، ''اردو افسانہ اور افسانہ نگار''، دہلی مکتبہ جامعہ، ۱۹۸۲ء

۳۱) فرمان فتح پوری، ''اردو کا افسانوی ادب''، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۸۸ء

۳۲) قمر رئیس، ڈاکٹر، ''ترقی پسند افسانہ''، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء

۳۳) قزلباش، سلیم آغا، ڈاکٹر، ''جدید افسانے کے رجحانات''، کراچی، انجمن ترقی اردو، سن ندارد

۳۴) منظر شہزاد، ''جدید اردو افسانہ ۱۹۴۷ء کے بعد''، کراچی، منظر پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

۳۵) معین الرحمٰن، سید، ''اردو افسانہ اور افسانہ نگار''، کراچی، اردو اکیڈمی۔ ۱۹۹۲ء

۳۶) محمد حسن، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ ۱۹۴۸ء کے بعد''، کراچی، اسلامیہ سنٹر، ۲۰۰۰ء

۳۷) محمد شفیق، ڈاکٹر، ''اردو افسانے پر بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے اثرات''، اسلام آباد، پورب اکیڈمی، ۲۰۰۷ء

۳۸) نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ روایت اور مسائل''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۳۹) نمود سلم، ''آغا گل کی افسانہ نگاری (گورچ) کے حوالے سے''، اسلام آباد، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۰۴ء

۴۰) اشرف خالد، ڈاکٹر، ''برصغیر میں اردو ناول''، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء

۴۱) آزاد اسلم، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد''، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء

۴۲) واجد محمود، ''لحہ لحہ زندگی (فکشن)''، کراچی زین پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۴۳) ایوب ہارون، ڈاکٹر، ''اردو ناول پریم چند کے بعد''، لکھنو، اردو پبلیشرز، ۱۹۷۸ء

۴۴) بخاری سہیل، ڈاکٹر، ''اردو ناول نگاری''، مکتبہ جدید، ۱۹۶۰ء

۴۵) بخاری سہیل، ڈاکٹر، ''آزادی کے بعد اردو ناول''، کراچی، انجمن ترقی ادب، ۱۹۹۸ء

۴۶) بخاری سہیل، ڈاکٹر، ''اردو ناول چند اہم زوایئے''، کراچی، انجمن ترقی ادب، ۲۰۰۳ء

۴۷) سرمست، یوسف، ڈاکٹر، ''اردو ناول بیسویں صدی میں اردو ناول''، حیدرآباد، نیشنل بک ڈپو، ۱۹۷۳ء

۴۸) عبدالسلام، ڈاکٹر، ''اردو ناول بیسویں صدی میں''، کراچی، اردو سندھ اکیڈمی، ۱۹۷۳ء

۴۹) فاروق احسن، ڈاکٹر، ''اردو ناول کی تنقیدی تاریخ''، لکھنو، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۹۲ء

۵۰) محمد یامین، ''ناول کا فن اور نظریہ''، پٹنہ خدا بخش لائبریری، ۲۰۰۲ء

۵۱) وانی احمد مشتاق، ڈاکٹر، ''تقسیم کے بعد اردو ناول تہذیبی بحران''، دہلی ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء

۵۲) وقار عظیم، سید، ''نیا افسانہ''، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۵۰ء

۵۳) آزاد اسلم، ڈاکٹر، ''اردو ناول آزادی کے بعد''، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء

۵۴) سبط حسن، ڈاکٹر، ''تہذیب کا ارتقاء''، دانیال پبلیشرز، لاہور، ۲۰۰۰ء

۵۵) جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اردو''، جلد اول، طبع دوم، لاہور، مجلس ترقی اردو، ۱۹۸۴ء

بلوچی کتب:

۱) انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، ''بلوچستان میں اردو ادب کے سو سال''، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۰۹ء

۲) انور رومان، پروفیسر، ''براہوی تہذیب وتمدن''، لاہور، ۱۹۶۷ء

۳) شاہ محمد مری، ڈاکٹر، ''بلوچ قوم قدیم عہد سے عصر حاضر تک''، شاہ محمد پرنٹرز تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۰ء

۴) شاہ محمد مری، ڈاکٹر، ''بلوچ قوم'']، بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۰ء

۵) محمد اسماعیل، دشتی الھوشہری، ڈاکٹر، ''بلوچ تاریخ اور عرب تہذیب'' مترجم محمد صادق، بلوچ، برکت اینڈ سنز، ۰۹۔ ۲۰۰۸ء

۶) محمد سعید دھوار، ''تاریخ بلوچستان''، بے نظیر انٹر پرائزرز زرغون روڈ، کوئٹہ، ۱۹۹۰ء

۷) انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، ''بلوچستان میں اردو ادب کے سو سال''، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۰۹ء

۸) عزیز محمد بھٹی، پروفیسر، ''بلوچستان سیاسی کلچر قبائلی نظام''، لاہور، ۱۹۹۵ء

۹) عزیز محمد بگٹی، پروفیسر، بلوچستان ادب ثقافت اور سماج''، کوئٹہ، ۱۹۹۲ء

۱۰) میر گل خان نصیر، ''تاریخ بلوچستان''، کوئٹہ، ۱۹۷۹ء

۱۱) نور احمد آفریدی، مولانا، ''بلوچ قوم اور اس کی تاریخ''، ملتان، ۱۹۶۸ء

۱۲) کامل القادری، ''براہوی رسوم'، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، ۱۹۷۴ء

۱۳) عبدالقدوس درانی، ''پشتون کلچر''، پشتو اکیڈمی بلوچستان، کوئٹہ، ۱۹۸۲ء

اخبارات ورسائل

۱) آغا امیر حسین، ''ابتدائیہ'' (ماہنامہ سپوتنک)، لاہور، جون ۲۰۰۴ء

۲) خلیل احمد، ''نامور ادیب ودانش ور آغا انور گل کا احوال''، ۲۰۰۶ء، Daily century express quetta august

۳) راجار سالو، ''ماہنامہ عوامی منشور''، کراچی ۲۰۰۴ء

۴) ریاض ہانس، ''آغا گل سے انٹرویو مشمولہ سہ ماہی ادب عالیہ'' جولائی اگست، ستمبر ۲۰۰۳ء

۵) ضیاء حسن ضیاء، ''آغا گل غور وفکر اور ارتقائی نقطہ نظر کے حامل ادیب''، روزنامہ مشرق ۲۵ ستمبر ۲۰۱۰ء

۶) خالد یوسف (آکسفورڈ انگلینڈ)، آغا گل کے مہماتی ناول''، روزنامہ باخبر کوئٹہ، ۸ مارچ ۲۰۰۹ء

۷) عرفان احمد بیگ، پروفیسر، ''سایہ محبت کا امین آغا گل''، روزنامہ جنگ کوئٹہ ۱۰ جون ۲۰۱۰ء

۸) قرأۃ العین حیدر، ماہنامہ سپوتنک، لاہور، جولائی ۲۰۰۴ء

۹) محمد صدیق سلوی، ''آغا گل''، ماہنامہ باخبر، جنوری ۲۰۰۲ء

۱۰) محمد عارف نوشاہی، آغا گل اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو''، مشرق میگزین، کوئٹہ ۲۹ مارچ ۲۰۰۹ء

۱۱) فیصل جہانگیر مغل، بلوچستان کے نامور ادیب افسانہ نگار اور منفرد شخصیت آغا گل، روزنامہ اعتماد، کوئٹہ، ۱۲ جنوری، ۲۰۰۹، ص ۵

۱۲) محمد عابد، ''بیلہ کار یمانڈ''، باخبر، یکم فروری ۲۰۰۹ء

۱۳) شاعر علی شاعر، ''تبصرہ''، 'بابو'، ماہنامہ چہار سو، راولپنڈی، جولائی ۲۰۱۱ء

۱۴) محمد حنیف بادینی، ''ماہنامہ 'بلوچی دنیا'، ملتان، جولائی ۲۰۱۱ء

۱۵) اشیر عبدالقادر شاہوانی، ''ماہنامہ 'بلوچی دنیا''، ملتان، ستمبر ۲۰۱۱ء

۱۶) کامل القادری، براہوی، ''براہو یا درار دو'، اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۹۸ء

۱۷) محمد مصلح الدین، ''ماہنامہ روشناس، آغا گل نمبر، جلد نمبر ۱۴، شمارہ نمبر ۶، نومبر ۲۰۱۱ء

ضمیمہ جات

POSTMASTER GENERAL
SINDH- BALOCHISTAN,
KARACHI

AGHA [redacted] GUL

ڈیئر اسٹوڈینٹ

یہ افسانہ Regionalism کی

تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ جس میں وارث شاہ نے "ہیر"

لکھی تھی۔ جینیوں کے ذکر میں اس دور کی تمام جینیوں کی

اقسام۔ عورتوں کے زیورات اور مروجہ فیشن وغیرہ

اسی تکنیک میں "فسانہ آزاد" ہے، یہ ناموں کی بھرمار

اور علم کی نمائش بے جا نہیں۔ بلکہ عصری تاریخ کے حوالے

سے منظر کشی ہے،

یہ ایک علامتی افسانہ ہے، جس کی علامتیں سمجھنا کچھ

اتنا سہل نہیں ہے، مثلاً "جبڑے" کا علامیہ ایک خاص

ذہنی سوچ کا عکاس ہے،

ii) غلام نبی اعوان کا مضمون آپ کے لیے

خاصہ مددگار ثابت ہوگا۔

۱۲ — ۲۸

19/10/2011

Address
St. 19, Block-II
Clifton, Karachi-75600

E-mail
pmgkarachi@yahoo.com

Telephone / Fax
Phone: 021-99250106
Fax : 021-99250109

POSTMASTER GENERAL
SINDH- BALOCHISTAN,
KARACHI

AGHA [redacted] GUL

سے پہلے نظر انداز کیا جاتا رہا تھا۔ ممنون ہوں کہ آپ صاحبانِ علم و دانش نے توجہ دی۔ جس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔

۔ غلام نبی اعوان کا ایک مضمون

۔ ایک تاریخی افسانہ "بدروح" (براہوئی) ارسال خدمت ہے۔ انشاءاللہ آپ سے مسلسل رابطہ رہے گا۔ آپ کی گفتگو بھی میرے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی۔

والسلام
آغا گل

19/10/2011

Address
St. 19, Block-II
Clifton, Karachi-75600

E-mail
pmgkarachi@yahoo.com

Telephone / Fax
Phone: 021-99250106
Fax : 021-99250109

Serial No. 000048

Registration No. 90/U.B/69-71

Roll No. 23

بلوچستان یونیورسٹی

University of Baluchistan
Quetta

نمبر شمار 000048

نمبر رجسٹریشن ۹۰/یو بی/۶۹-۷۱

رول نمبر ۲۳

FACULTY OF ARTS

Master of Arts

Whereas AGHA ANWAR GUL S/O MOHD AKBER KHAN

has pursued a course of study prescribed by this University for the degree of Master of Arts in URDU and has passed the requisite examination, held in MARCH 1972 having been placed in SECOND class.

It is hereby certified that he/she has this day been duly admitted to the degree of Master of Arts in this University at the Convocation of .... 19.....

کلیہ آرٹس

ایم - اے

ہرگاہ آغا انور گل ولد محمد اکبر خان

نے اردو کے مضمون میں ایم - اے کی سند کے لئے اس جامعہ کے منظور شدہ نصاب کی تکمیل کر لی ہے، اور مطلوبہ امتحان منعقدہ مارچ ۱۹۷۲ء میں کامیاب ہو کر دوسرا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ انہیں آج کے دن جلسہ تقسیم اسناد .... ۱۹ء کے موقعہ پر اس جامعہ میں ایم - اے کے درجہ پر فائز کیا گیا۔

Vice Chancellor وائس چانسلر

Dated, Quetta the 15TH JANUARY 1975

Registrar رجسٹرار

کوئٹہ بتاریخ ۱۵ جنوری ۱۹۷۵ء

Note:- Detailed transcripts of examination results have been issued separately.

نوٹ: امتحان کے نتیجہ کی تفصیلات علیحدہ جاری کر دی گئی ہیں۔

بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ

University of Baluchistan
Quetta

Serial No. 007996

Registration No. [illegible]/IB/69-71.

Roll No. [illegible].

FACULTY OF ARTS

Master of Arts

Whereas AGHA ANWAR GUL S/O MUHAMMAD AKBAR KHAN.

has pursued a course of study prescribed by this University for the degree of Master of Arts in ENGLISH and has passed the requisite Annual/~~Supplementary~~ examination of 1992 held in DEC: 1993, having been placed in the THIRD Division. The examination was taken ~~as a whole~~/in parts.

It is hereby certified that he/she has duly been admitted to the degree of Master of Arts in this University.

Quetta, dated the 6TH JUNE, 1994.

Vice Chancellor

Registrar

Note:- Detailed transcripts of examination results have been issued separately.

نمبر شمار :- ۷۹۹۶

رجسٹریشن نمبر :- ۱۹۹۰/یوبی/۶۹-۷۱

رول نمبر :- ۱۲۹۵

کلیۂ فنون

ایم - اے

ہرگاہ آغا انور گل ولد محمد اکبر خان

نے انگریزی کے مضمون میں ایم - اے کی سند کے لئے اس جامعہ کے منظور شدہ نصاب کی تکمیل کر لی ہے، اور مطلوبہ امتحان سالانہ/~~ضمنی~~ ۱۹۹۲ء منعقدہ دسمبر ۱۹۹۳ء میں کامیاب ہو کر سوئم درجہ حاصل کر لیا ہے - امتحان میں ~~کلی~~/بالاجزا شرکت کی گئی۔

لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ انھیں اس جامعہ میں ایم - اے کے درجہ پر فائز کیا گیا۔

وائس چانسلر

رجسٹرار

کوئٹہ بتاریخ ۶ جون ۱۹۹۴ء

نوٹ : امتحان کے نتیجہ کی تفصیلات علیحدہ جاری کر دی گئی ہیں۔

Serial No. 000770

Registration No. 90/U.B/69-71

Roll No. 1112

نمبر شمار 000770

نمبر رجسٹریشن : ۹۰/یو-بی/۶۹-۷۱

رول نمبر : ۱۱۱۲

بلوچستان یونیورسٹی

University of Baluchistan

Quetta

FACULTY OF ARTS

Master of Arts

Whereas AGHA ANWAR GUL S/o MOHD AKBAR KHAN

has pursued a course of study prescribed by this University for the degree of Master of Arts in POLITICAL SCIENCE and has passed the requisite examination, held in JULY-AUGUST 1977 having been placed in SECOND class.

It is hereby certified that he/she has this day been duly admitted to the degree of Master of Arts in this University at the Convocation of XX XX XX 19 XX

کلیہ آرٹس

ایم - اے

ھرگاہ آغا انور گل ولد محمد اکبر خان

نے سیاسیات کے مضمون میں ایم - اے کی سند کے لئے اس جامعہ کے منظور شدہ نصاب کی تکمیل کر لی ہے، اور مطلوبہ امتحان منعقدہ جولائی - اگست ۱۹۷۷ء میں کامیاب ہو کر دوئم درجہ حاصل کر لیا ہے۔

PRIVATE

لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ انہیں آج کے دن جلسہ تقسیم اسناد XX XX ۱۹ء کے موقعہ پر اس جامعہ میں ایم - اے کے درجہ پر فائز کیا گیا۔

Vice Chancellor وائس چانسلر

Dated, Quetta the 24TH MAY 1976.

کوئٹہ بتاریخ ۲۴ مئی ۱۹۷۶ء

Registrar رجسٹرار

Note:- Detailed transcripts of examination results have been issued separately.

نوٹ: امتحان کے نتیجہ کی تفصیلات علیحدہ جاری کر دی گئی ہیں۔

POSTMASTER GENERAL
SINDH- BALOCHISTAN,
KARACHI

AGHA [redacted] GUL

محترم پروفیسر طیب منیر صاحب،

السلام علیکم۔

نہایت ممنون ہوں کہ آپ THESIS اپنی زیر نگرانی مکمل
کروا رہے ہیں۔ بلکہ مجھے بھی آج کی گفتگو سے کافی فائدہ پہنچا۔ اور
یہ بھی اشد ضروری۔ کیونکہ ادیب کا ذہنی ارتقاء سمجھنا بھی ازبسکہ
ضروری ہے۔

میں نے افسانے میں مختلف تجربات کیے۔ ہیئت کے لحاظ سے
بھی اور علامتوں کے استعمال سے بھی۔ اساطیری حوالوں سے بھی لکھے اور
تاریخی حوالوں سے بھی۔ چونکہ بلوچستان کو مجموعی طور پہ کم جانا جاتا ہے، میں
نے "گھوا فلو" افسانوی مجموعہ میں براہوی BRAHVI بولنے والے کرداروں کی بیرونی
دنیا سے روشناس کرایا۔ وطن عزیز پاکستان کیلئے ازحد ضروری ہے کہ
مختلف انداز زندگی تہذیبی قریب آکر پاکستانی تہذیب و ثقافت میں
یکجا ہو۔ اور یہ کام ادب بخوبی انجام دے سکتا ہے۔
آپ کی توجہ کا طلب گار رہوں گا، بلوچستانی ہونے کے سبب
میری تحریروں کو مقامی ادب کے ذمرے میں لا کر ڈاکٹر رشید امجد اور آپ

Address
St. 19, Block-II
Clifton, Karachi-75600

E-mail
pmgkarachi@yahoo.com

Telephone / Fax
Phone: 021-99250106
Fax : 021-99250109